جلد ۱ نمبر ۵

مئی ۱۹۱۸ء

ذخیرہ

ایڈیٹر سید نورالحسن ہوش بلگرامی

(فہرست مضامین)

قیمت سالانہ (عہ)

فی پرچہ ۸/

۱۳۴۴ -

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مندرجۂ ذیل خطبۂ صدارت جو مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے ندوۃ العلما کے سولھویں (۱۶) سالانہ جلسہ منعقدہ ماہ اپریل سنہ ۱۹۱۶ع بمقام مدراس کے لئے لکھا تھا اگرچہ آپ عین وقت پر علیل ہو جانے کے باعث مدراس جانے سے معذور رہے تھے لیکن خطبۂ صدارت چھپوا کر اجلاس میں تقسیم کرنے کے لئے بھیج دیا تھا۔

یہ فاضلانہ خطبہ ہندوستان میں تعلیم دین اسلام و علوم عربیہ کی اشاعت کا حال ظاہر کرتا ہے اور علم دین کے موجودہ زوال پر نظر ڈال کر اصلاح و ترقی کی موثر تدابیر بتاتا ہے۔ اس خطبہ کی خوبیوں کا اعتراف نواب عماد الملک بہادر ایسے ماہر فن اور شفیق تعلیم نے اپنے خطبۂ صدارت حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس میں فرمایا ہے اور فی الواقع اس خطبہ کے مفید و علمی مضامین تجدید اشاعت کی ایک عرصہ سے سفارش کر رہے تھے حسن اتفاق کہ ایک روز نواب عماد الملک بہادر نے فرمایا کہ اس خطبہ کو ذخیرہ میں نقل کر دینا چاہیے تا کہ اس کے علمی مضامین سے ناظرین ذخیرہ بھی بہرہ اندوز ہوں۔ ہم نہایت مسرت کے ساتھ اس کو درج کرتے ہیں اور ناظرین سے بھی عرض کریں گے کہ وہ اس کی ایک ایک سطر کو بہ نظر تعمق ملاحظہ کریں اور دیکھیں کہ لکھنے کا ڈھنگ، طرز بیان کی خوش اسلوبی اور بیان کی سادگی حالی و آزاد کو داد دینے کے لئے پکار رہی ہے۔

ایڈیٹر

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

حضرات علمائے کرام ومعززین امت!

بغداد شریف کے مدرسہ نظامیہ کا سارے عالم میں شہرہ ہے امام فخرالاسلام جب اول مرتبہ وہاں مسند درس پر بیٹھے تو انہیں وہ اکابر یاد آئے جن سے مسند مذکور مزین رہ چکی تھی مثلاً شیخ ابو اسحٰق شیرازی و امام غزالی۔ اس خیال سے امام ممدوح کے دل پر ایک چوٹ سی لگی آنکھوں پر عمامہ رکھکر بے اختیار رو دئے اور فرمایا ؎

خلت الدیار فسدت غیر مسوّد
ومن العناء تفردی بالسؤدد

زمانہ اہل کمال سے خالی ہو گیا تو مجھ سا بے مایہ سرگروہ بنا
مجھ سے آدمی کا سالار یگانہ بننا کیسا اندوہ افزا ہے

آج کا حسرت انگیز سماں اس مثال سے کس قدر مطابق ہے جو کرسی جناب استاذ العلماء مفتی محمد لطف اللہ صاحب مغفور اور مولنا احمد حسن صاحب مرحوم سے بزرگوں کی صدارت سے شرف حاصل کر چکی ہو اس پر ایک ایسے شخص کا بیٹھنا جو نہ عالم ہے نہ کسی علمی خاندان کا فرد فی الحقیقۃ حیرت خیز اور عبرت انگیز منظر ہے میں کبھی اس مقام پر قدم رکھنے کی جرأت نہ کرتا اگر میرے تحیر کو ایک میرے مخدوم یہ کہکر دور نہ فرما دیتے کہ ناموت الکبراء اس مشہور مقولہ نے مجھکو یہ اطمینان دلا دیا کہ میرا کوئی شرف باعث انتخاب نہیں ہوا بلکہ بزرگان امت نے میری کم مائگی کو نظر قبول سے ملاحظہ فرمایا ہے اب یہ بے سروسامانی میرے واسطے سرمایۂ فخر ہے اور میں اپنی بے بضاعتی کے اعتراف و اقرار کے ساتھ حقیر ہدیہ اور خدمت کے واسطے حاضر ہوں ؎

بہ نازم بہ بزم محبت کہ آنجا
گدائے بہ شاہے مقابل نشیند

بایں ہمہ سمجھتا ہوں کہ یہ شرف ایسا ہے جو ناز ش عمر اور کارنامہ زندگی مانا جا سکتا ہے پس جن بزرگوں نے یہ اعزاز عطا فرمایا ہے ان کے شکریہ و سپاس سے میرا دل مالا مال ہے جزاھم اللہ عنی خیر الجزاء یہ عرض بھی ضروری ہے کہ بدون آپ کے کرم اور توجہ کے میں اس خدمت کا حق ادا نہ کر سکوں گا۔

بزرگان قوم! مجلس ہذا کے مقاصد و اغراض کے اعتبار سے نیز اس لحاظ سے کہ زمانہ حال میں عموماً مسلمان علوم عربیہ سے بے پروا نظر آتے ہیں مناسب ہو گا کہ میں اس موقع پر علوم عربیہ کی مختصر تاریخ عظمت اور وسعت بیان کروں تاکہ معلوم ہو کہ کیسی شاندار امانت (جو اسلاف کی محنتوں کا نتیجہ اور حق و صداقت کا ذخیرہ ہے) ہمارے ہاتھوں میں ہے اور ہم کو کیسے بے مثال سرمایہ کی حفاظت و ترقی کا حق ادا کرنا ہے کلام ربانی اور احادیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دین الٰہی کے اہم مقاصد میں سے ایک مقصد علم کی ترویج و اشاعت بھی تھا۔ کلام مجید میں بار بار مختلف پیرایوں میں علم اور علما کی فضیلت بیان فرمائی ہے اور حصول علم کی تاکید مثلاً چند آیتیں نقل کرتا ہوں

وَيَرْفَعُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ۔
اور بلند کرے گا اللہ تم میں سے ان لوگوں کے جو ایمان لائے ہیں اور ان کے جو علم والے ہیں بہت سے درجے

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۔
جس کو حکمت دیدی گئی اس کو بڑی بھاری دولت بخش دی گئی

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ۔
اللہ سے ڈرنے والے صرف علما ہیں۔

خشیتہ الٰہی جو ذریعہ ہے نجات اور اجر کریم اور ہدایت پانے کا اس کو گروہ علما میں منحصر فرما دینا علما کی انتہائی شان پر دلالت کرتا ہے۔
سب سے زیادہ علمی ترقی کا محرک وہ آیتیں ہیں جن میں آیات ربانی

اور مظاہر قدرت پر غور و تدبر کی تاکید فرمائی گئی ہے اور یہ مظاہر قدرت اس قدر وسیع ہیں کہ طبعیات، زرعیات، برقیات، فلکیات، ارضیات وغیرہ تمام علوم اُن کے لاانہایت دائرہ میں آجاتے ہیں۔

ارباب تفسیر نے لکھا ہے کہ حضرت آدم کو ملائکہ کا سجدہ کرنا تعظیم علم کے سبب سے تھا نہ صرف حصول علم کی تاکید ہے بلکہ علم میں برابر ترقی کرنے کا حکم ہے چنانچہ حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دُعا تلقین فرمائی گئی:۔

رب زدنی علما

یارب میرے علم کو بڑھا:

حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کلام ربانی کی تائید اسی اہتمام سے فرمائی ارشاد ہے:۔

العلم حیات الاسلام وعماد الدین۔	علم اسلام کی جان اور دین کا ستون ہے۔
العلم سلطان اللہ فی الارض فمن وقع فیہ فقد ہلک	علم زمین پر خدا کی قوت ہے جو اُس سے مقابل ہوا تباہ ہوا۔
العلم خلیل المومن والعقل دلیلہ:	علم مومن کا دوست اور عقل رہنما ہے۔
العلماء مصابیح الارض وخلفاء الانبیاء وورثتی وورثۃ الانبیاء۔	علما زمین کی روشنی ہیں اور انبیا کے نائب اور میرے اور انبیا کے جانشین۔
وزن حبر العلماء بدم الشہداء فرجح علیہ۔	علما کی روشنائی شہدا کے خون سے وزن کی گئی تو اُسکا پلہ بھاری رہا۔
ما تصدق الناس بصدقۃ افضل من علم:	علم پھیلانے سے بہتر کوئی صدقہ نہیں۔

وہ علم باعث بربادی ہے جس پر عمل نہ ہو۔

مثل العالم الذی یعلم الناس الخیر وینسی نفسہ کمثل السراج یضیئ للناس ویحرق نفسہ:	جو عالم اوروں کو نیکی سکھائے اور خود اپنے نفس کو بھول جائے وہ مثل چراغ کے ہے جو لوگوں کی روشنی کرا کے اپنے آپ کو خاک سیاہ کر دیتا ہے
اشد الناس عذابا یوم القیامۃ عالم لم ینفعہ علمہ	جس عالم کو اس کا علم نفع نہ پہنچائے اُس کو قیامت میں سب سے زیادہ شدید عذاب ہوگا۔
علم لا ینفعہ کالکنز لا ینفق بہ:	علم غیر نافع ایسا خزانہ ہے جو صرف نہ کیا جائے۔

علاوہ قولی تاکید کے عملاً بھی علم و علما کی شان و فضیلت کا اظہار فرمایا ہے چنانچہ ایک مرتبہ مسجد میں حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ وہاں دو حلقے تھے ایک میں کچھ آدمی خدائے تعالیٰ سے دعا مانگ رہے تھے دوسرے میں درس و تدریس جاری تھی آپ نے ارشاد فرمایا:۔

انما بعثت معلما

میں تو تعلیم دینے آیا ہوں:

یہ فرما کر درس و تدریس کے حلقہ میں تشریف فرما ہو گئے۔ اس پاک تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ صحابۂ کرام میں علم کا ذوق سرایت کر گیا اور وہ فدائیا گروہ علوم کی ترویج پر کمربستہ ہو گیا۔

سب سے اول کلام الٰہی اور حدیث و فقہ کی حفاظت و اشاعت پر توجہ فرمائی اُس سعی کا یہ نتیجہ ہے کہ صدہا برس گزر جانے پر بھی علم کے یہ دونوں سرچشمے تحریف و تصحیف کے گرد و غبار سے پاک اور صاف اپنے فیض سے عالم کو سیراب کر رہے ہیں علاوہ دینی علوم کے دوسرے علوم کی خدمت کی بنیاد مسلمانوں میں خود صحابۂ کرام کے زمانہ میں پڑ چکی تھی۔ باب مدینۃ العلم حضرت علی مرتضیٰ

تربیت یافتہ تھے اور ابھی یہ امر بحث طلب ہے کہ ہمارے جدید
تعلیم یافتہ گروہ نے اُن سے بہتر کہاں تک مسئلہ تعلیم کو سمجھا ہے۔ اس
زمانہ میں ہمارے قدیم علوم کے اساتذہ اور طلبہ دونوں میں یہ خیال
دل نشین ہے کہ اگلے علما کی کامیابیوں کا سنگ بنیاد وہ فراغ خاطر
اور فراخ دستی تھی جو اس عہد کی قدر دانی کا نتیجہ تھی۔ میں بلا تامل
کہتا ہوں کہ یہ خیال گزشتہ اہل کمال کی جناب میں گستاخی بلکہ اُن پر ظلم ہے آپ
اُن بزرگوں کے حالات پڑھنے سے آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ ہم اُن سے
بہت زیادہ فارغ البال اور امن میں ہیں مثلاً سنئے۔ امام بخاری
کو ایام طالب علمی میں ایک مرتبہ تہی دستی کے ہاتھوں مجبور ہو کر تین
روز متواتر جنگل کی بوٹیاں کھانی پڑیں امام ابو علی بلخی جب عسقلان
میں تھے تو خرچ سے اس قدر تنگ ہوئے کہ کئی فاقوں کی نوبت
پہنچی جب بھوک نے بہت ستایا تو نان بائی کی دکان پر اس غرض سے
جا بیٹھے کہ اس فقدانِ قوت کی حالت میں کھانے کی خوشبو سے ہی
کچھ قوت حاصل کر لیں یہ تو مثالیں فراخ دستی کی ہیں۔ فارغ البالی
ملاحظہ ہو علوم عقلیہ میں شفا و اشارات کا جو درجہ ہے اُس سے
ہر طالب علم واقف ہے شیخ الرئیس نے اشارات اس حالت میں لکھی کہ
جان کے خوف سے ایک لوہار کے گھر میں چھپا ہوا تھا اسی لوہار سے
سامان تحریر منگوا کر یہ بے نظیر کتاب لکھدی۔ ہمارے علما کے حالات
میں یہی ایک واقعہ نہیں ہے ہزاروں واقعات ایسے گزرے ہیں
اصل راز علمائے قدیم کی کامیابی کا وہ شوق طلب تھا جو علمی
شیفتگی سے پیدا ہوتا تھا اور یہی شوق منزل کی ہر دشواری کو آسان
کر دیتا تھا امام ابو حاتم رازی نے شوق طلب میں نو ہزار میل سفر
پیادہ پا کیا تھا ہزار تک شمار کر کے اُنھوں نے میلوں کو شمار کرنا چھوڑ دیا
کتاب النفس ارسطو کا ایک نسخہ کسی کے ہاتھ لگا جس پر حکیم ابو نصر فارابی
کے ہاتھ کی یہ عبارت تحریر تھی انی قرات ہذا الکتاب مائۃ
مرۃ یعنی میں نے اس نسخے کو سو بار پڑھا۔ امام مزنی نے کتاب الام امام
شافعی کا مطالعہ مسلسل پچاس برس تک کیا اور اُن کا بیان ہے
کہ ہر دفعہ کے مطالعہ میں نئے فوائد حاصل ہوئے یہ کھلا ہوا راز ہے
کہ اب اس علمی شیفتگی کا نشان بھی نہیں الا ماشاء اللہ اسی لئے
مدرسوں میں ہر طرف کمال کا زوال ہے۔

ہمارے علم و کمال کی تصویر کا یہ روشن پہلو تھا دوسرا پہلو بھی دیکھنا
باقی ہے زمانے کے انقلاب نے ہماری تعلیم قدیم کا شیرازہ
پریشان کر دیا پرانی درسگاہیں مٹ گئیں سلسلہ تعلیم درہم
برہم ہو گیا قدیم اساتذہ کے ساتھ اس کا طریقہ تعلیم بھی رخصت
ہوا۔ علمی خزانے یعنی کتاب خانے جن کی ملک میں کچھ انتہا نہ تھی
تباہ و برباد ہو گئے جو سرمایہ بچا وہ یورپ و امریکہ کی قدر دانی کی
بدولت وہاں کے کتاب خانوں کی زینت بن گیا۔ ان تمام اسباب
کا یہ نتیجہ ہوا کہ ارادوں میں سستی، حوصلوں میں پستی پیدا ہو گئی
تعلیم کی غرض و غایت بجائے حصول علم و کمال کے چند کتابوں کی
عبارت و الفاظ میں منحصر ہو گئی جن میں کثیر حصہ تخیلات کا تھا
اس تعلیم کے اثر نے بحث و مباحثے کی نوبت نزاع و خصومت
تک پہنچا دی اور ہر طرف جھگڑوں اور مخالفتوں کے معرکے گرم
نظر آنے لگے اسی کے ساتھ جدید تعلیم کے اثر نے جدید و قدیم
خیال کے دو گروہ علٰحدہ علٰحدہ ہم میں پیدا کر دیے ہندوستان
کے قدیم شرفا کے خاندان جو علوم قدیمہ کے ملجا و ماویٰ تھے زمانہ
کی ضرورتوں سے مجبور ہو کر خانقاہوں اور مدرسوں سے نکلکر
اسکولوں اور کالجوں میں جا پہنچے ایک زمانے میں میں نے
عربی مدارس کے طلباء کی مردم شماری بہ لحاظ وطن اور مسکن
کے کی تھی اُس سے معلوم ہوا کہ خاص ہندوستان کے طلبہ
کا وجود اُن مدرسوں میں مفقود تھا صرف آفاقی طلبہ کے دم سے

ان کی رونق باقی تھی۔
اس پست حالت کا احساس بعض اُن اہل دل کو ہوا جو علوم
قدیمہ کے ساتھ ساتھ حالاتِ جدید کے احساس کی قابلیت
دماغ میں اور تباہی ملت کا درد دل میں رکھتے تھے۔ ان بزرگوں نے
۱۳۱۱ھ میں جس کو آج پچیس برس کا زمانہ گذرا اس مجلس عالی کی
بنیاد ڈالی جن آنکھوں نے ندوۃ العلما کا پہلا اجلاس دیکھا ہے وہ
تصدیق کر سکیں گے کہ وہ منظر سر زمین ہند میں اپنی آپ نظیر تھا۔
مختلف خیال و عقائد کے علما اس مقصد سے جمع ہوئے کہ نفسانیت
اور خصومت کو خدمتِ ملت کی خاطر علیحدہ رکھکر علوم عربیہ کی ترقی
اور تباہ کن نزاعوں اور جھگڑوں کی بیخ کنی کی تدابیر پر غور کریں
غالباً ہندوستان میں کوئی حصہ ملک اور فرقہ علما ایسا نہ تھا جسکے
قائم مقام اس اجلاس میں کشادہ دلی اور وسعت خیال کے ساتھ
شریک نہ ہوئے ہوں۔ ابتدائے ندوۃ العلماء کے دو مقصد تھے
رفع نزاع باہمی اور نصاب تعلیم کی اصلاح۔ آج سے پچیس برس
پہلے کے حالات اور علماء کے فرقوں کی اگر چھان بین کی جائے تو
عیاں ہو سکتا ہے کہ مختلف فرقوں کی مذہبی جنگ و جدل کی
اس وقت کیا حالت تھی ندوۃ العلما کا مقصود یہ تھا کہ مذہبی
مباحثوں میں مناظرہ کی شان رہنی چاہئے مکابرہ اور مجادلہ تک
نوبت نہ پہنچے ہر فرقہ کو مذہبی مباحثوں میں یہ امر ملحوظ رکھنا چاہئے
کہ جو امر اُن کے نزدیک حق ہو اُس کو شان علم و تہذیب کا لحاظ
رکھکر بیان کریں یہ نہ ہو کہ مباحث کی نوبت نفسانیت اور جدل
تک پہنچ جائے جس سے اصل مقصود فوت ہو کر محض فتنہ و فساد
باقی رہ جائے۔

خلاصہ یہ کہ اختلاف و نزاع کے اُس نازک فرق کو پیش نظر رکھنا
چاہئے جو تابعی جلیل القدر یحییٰ بن سعید نے اِس مقولے میں متعین
فرمایا ہے اهل العلم اهل توسعة وما برح المفتون
يختلفون فيحل هذا ويحرم هذا فلا يعيب هذا
على هذا یعنی علما اہل وسعت ہیں اور مفتی ہمیشہ باہم اختلاف
کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ایک ایک چیز کو حلال بتاتا ہے
دوسرا حرام لیکن ایک دوسرے کی عیب گیری نہیں کرتا حضرت
امام جعفر صادق کا کس قدر پاکیزہ مقولہ ہے ایاکم والخصومة
في الدين فانها تشغل القلب و تورث النفاق یعنی دین
میں جھگڑنے سے بچو اس لئے کہ یہ جھگڑا دل کو (کام کی باتوں)
باز رکھتا ہے اور نفاق پیدا کر دیتا ہے۔ چونکہ یہ بحث بہت
نازک ہے اس لئے اس موقع پر اس سے زیادہ بحث کرنا مناسب نہیں ہے
ندوۃ العلما کی کوشش اور سعی اس مقصد کے حاصل کرنے میں
کہاں تک کامیاب ہوئی اس کو اس بین فرق نے ثابت کر دیا
جو بعد کو مذہبی نزاعوں کی شدت میں نظر آیا دوسرے سالانہ
اجلاس ندوۃ العلما میں مشرقی اضلاع کے دو زبردست اور
ذی اثر عالموں کی باہمی مصالحت ہمیشہ یادگار رہے گی اس مصالحت
نے ہزاروں مسلمانوں کی تباہی کو روک دیا چند ہی روز کے بعد
جب ندوۃ العلما کو خود ان نزاعوں کی زد میں آنا پڑا تو پورے ضبط
و استقلال کے ساتھ اُس نے اپنے مقصد کو پیش نظر رکھا اور ایک
سطر بھی اُس کی جانب سے ایسی نہیں لکھی گئی جو اس مقصد کی
منافی ہوتی۔

اسی وسعت خیال کا نتیجہ وہ ربط و انبساط ہے جو ندوۃ العلما کی
سعی سے علما اور جدید تعلیم یافتہ گروہ میں پیدا ہوا پٹنہ کا اجلاس
ندوۃ العلما اس اعتبار سے ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ان دونوں
گروہوں میں وہاں مصالحت ہوئی اُس موقع پر ہمارے مخدوم
مولانا شاہ سلیمان صاحب نے اپنے مخصوص لہجہ میں بلبل شیراز کا

یہ شعر اہل جلسہ کو سنایا تھا ؎

شکر للہ کہ میان من و او صلح فتاد
حوریاں رقص کناں ساغر و پیمانہ زدند

الحمد للہ کہ وہ صلح اب تک قائم ہے اور اُس کے آثار اس اجلاس میں بھی نمایاں ہیں۔

دوسرا مقصد ندوۃ العلما کا عربی نصابِ تعلیم کی اصلاح تھی۔ میں نے اوپر عرض کی ہے کہ ہندوستان میں علوم عربیہ مختلف ممالک سے آئے تھے قدرتی طور پر اُن ملکوں میں جن علوم کا چرچا تھا وہی ہندوستان کے مختلف حصوں میں رائج ہوئے سندھ میں سلسلۂ علم خراسان اور ما وراء النہر (ترکستان) سے آیا ان ممالک میں فقہ اور معقولات کو بہت ترقی تھی لہٰذا جب ملتان مرکز علم بنا تو وہاں کی درس تدریس میں ان علوم کا عنصر غالب تھا دو سو برس تک یعنی ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں طریقہ تعلیم اسی رنگ میں رہا۔ اُس عہد میں علم نحو، بلاغت، فقہ، تصوف، اور تفسیر معیار فضیلت خیال کئے جاتے تھے۔ حدیث ادب وغیرہ برائے نام پڑھائے جاتے تھے نویں صدی ہجری میں دار العلوم ملتان کو زوال ہوا۔ یہاں سے علما ملک کے مختلف حصوں میں گئے ان بزرگوں میں مولنا عبد اللہ تلبنی نواحِ دہلی میں آئے اور اُن کے شاگرد مولنا عزیز اللہ سنبھل پہنچے یہ زمانہ سکندر لودی کی سلطنت کا تھا سلطانِ مذکور نے ان دونوں بزرگوں کی تشریف آوری ایک نعمت غیبی سمجھی اور اُن کے واسطے درسگاہیں بنا دیں اُس کو اُن کے درس سے اس قدر شوق تھا کہ کبھی کبھی مدرسہ میں آتا اور کسی گوشہ میں چھپکر اُن کا پڑھانا سنتا ان دونوں اہل کمال نے قدیم نصاب تعلیم میں تغیر کیا مولنا [illegible] تلبنی [illegible] یزدی شرح تہذیب [illegible]

شاگرد تھے اس لئے قدرۃً منطق کا پلہ زیادہ بھاری ہوا نیز علامہ تفتازانی اور میر سید شریف کی تصانیف شامل درس کی گئیں دسویں صدی ہجری کے آخر میں محقق دوانی صدر شیرازی اور میرزا جان شیرازی کے تصانیف ہندوستان میں پہنچکر داخلِ درس ہوئیں اور معقولات کی تعلیم کا دور دورہ پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا۔ اس ترقی علمی میں نمایاں حصہ میر فتح اللہ شیرازی کا ہے جو اکبری نورتن میں تھے۔

اسی طبقۂ علما میں علامہ قطب الدین سہالی تھے جو علمائے فرنگی محل کے مورث ہیں اسی زمانہ میں بعض اہل علم ملک عرب تشریف لیگئے اور وہاں سے علم حدیث حاصل کرکے ہندوستان واپس آئے ان بزرگوں میں شیخ محمد طاہر صاحب مجمع البحار شیخ یعقوب کشمیری اور شیخ عبد النبی گنگوہی قابل ذکر ہیں چونکہ گجرات میں علم ملک شام یمن سے بھی آیا تھا اس لئے وہاں علم حدیث کا دریا جاری تھا ہندوستان سے کچھ علما گجرات گئے اور وہاں سے علم حدیث پڑھکر مراجعت کی غرض اس طرح دسویں صدی ہجری میں علم حدیث کو بھی ایک حد تک رواج ہوا (مگر معقولات میں علما اور طلبا کی محویت کی وجہ سے بہت کم ہوا) بالآخر شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی مساعی جمیلہ نے فیض کے دریا بہائے اور ایک مخلوق کو علم حدیث سے بہرہ یاب کیا۔ بلحاظ نظام درس یہ تیسرا طبقۂ علما تھا۔

بارھویں صدی ہجری میں چوتھے طبقے کا آغاز ہوا۔ استاذ الہند ملا نظام الدین صاحب نے نصابِ تعلیم میں جدید تغیر کیا اور وہ نصاب مرتب فرمایا جو آج تک درس نظامی کے نام سے مشہور اور تمام مدارس میں کمی بیشی کے ساتھ رائج ہے اس نصاب تعلیم سے زیادہ تر مقصود یہ تھا کہ [illegible] طلبہ میں دقتِ نظر اور قوتِ مطالعہ

پیدا ہو۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ بوجوہ احسن یہ مقصد درس نظامیہ سے حاصل ہوا۔ اسی دور میں دہلی میں شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم نے علم حدیث کی ترویج پر کمر ہمت باندھی اور ہمارے ملک کا بچہ بچہ اس سے واقف ہے کہ شاہ صاحب کی کوشش میں خداوند تعالیٰ نے برکت عظیم عطا فرمائی اور اس خاندان کی سعی سے ہندوستان دار الحدیث بن گیا ملا نظام الدین صاحب کے بعد درس نظامی میں کتب منطق کا اضافہ کثیر کیا گیا اور وہ کتابیں بڑھائی گئیں جو درس نظامیہ کے ... وین کی وقت تصنیف بھی نہ ہوئی تھیں مثلاً حاشیہ غلام یحییٰ، قاضی مبارک حمد اللہ وغیر ذلک اس کے متعلق ایک عجب واقعہ ہے۔ شارحین سلم العلوم کے تلامذہ اپنے استادوں کے شروح پڑھتے پڑھاتے تھے اور ان میں باہم اس پر نزاع رہتا تھا کہ کس کی شرح بہتر ہے مدرسین جب اُس سے تنگ آگئے تو اُنھوں نے سب شرحیں داخل درس کر دیں اس طرح سلم العلوم کے شروح و حواشی گویا تمام درس نظامی پر حاوی ہو گئے۔ (ان تمام معلومات کے لئے میں اپنے محترم حکیم سید عبد الحی صاحب ناظم ندوۃ العلماء کا ممنون ہوں)۔

مذکورۂ بالا بیان سے آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ کس طرح صدیوں تک منطق و حکمت کا اضافہ ہمارے عربی مدارس کے نصاب میں ہوتا رہا۔ اِن فنون کی خالص کتابیں در کنار قریبًا تمام باقی علوم کی بھی وہی کتابیں داخلِ درس ہونے کے قابل سمجھی گئیں جو علوم معقول سے مالامال تھیں اور اس طرح اول سے آخر تک منطق کا سکہ مدارس عربیہ پر بیٹھا ہوا تھا ندوۃ العلما جس وقت قائم ہوا اُس وقت نظام درس کی یہ حالت تھی کہ طلباء کی عمر کا کثیر حصہ منطق کی تحصیل میں صرف ہوتا تھا (فن منطق کی تحصیل میں بھی اُن سنگ لاخ کتابوں کی تحصیل میں جو گو شامل منطق تھیں مگر اُن میں وہ مسائل تھے جن کو منطق کے مسائل نہیں کہہ سکتے مثلاً وجود علم وغیرہ کے متعلق مباحث) ادب عربی کی بہت سی معرکۃ الآرا کتابیں داخلِ درس تھیں اور طلبہ اُن کو نہایت جانفشانی سے پڑھتے تھے تاہم عربی عبارت لکھنے یا بولنے سے عاری رہتے تھے قرآن مجید کی خدمت بہت کم تھی یہ کھلا ہوا راز ہے کہ جو دماغ ذوق معقول میں سرشار تھے وہ منقول کو اس نظر سے دیکھتے تھے کہ اُس سے ذہن میں سطحیت پیدا ہوتی تھی اس پر کوئی شبہ نہیں کہ اگلے اساتذہ کی طرز تعلیم اور صحبت کی برکت بہت کچھ نشہ معقول کے حق میں تریاق کا کام دیتی تھی اسی کے ساتھ ساتھ قریبًا ہر درس گاہ عظیم کے ساتھ خانقاہ بھی لگی ہوتی تھی جو اخلاق کی صفائی اور باطن کی پیراستگی میں اکسیر کا حکم رکھتی تھی اور طلبہ مدرسوں سے فارغ ہو کر خانقاہوں سے فیض حاصل کرتے تھے۔

انقلابِ زمانہ سے یہ سامان اصلاح تو مفقود ہو گئے منطقی کتابوں کا بارِ گراں طلبہ کے دوش پر رہ گیا اسی کے ساتھ ساتھ زمانہ کی جدید ضرورتیں اس امر کی متقاضی تھیں کہ طلبہ کا کچھ بوجھ ہلکا کیا جائے تاکہ وہ اِن ضرورتوں کی جانب توجہ کر سکیں یہ اسباب تھے جنھوں نے ندوۃ العلما کے مقاصد میں اصلاح نصابِ تعلیم کو داخل کیا اور ارکین ندوہ نے یہ عزم کیا کہ علمائے سلف کی سنت قدیم کے مطابق نصابِ تعلیم میں ضروری ترمیم فرمائیں ابتداءً اس مقصد کی مخالفت ہوئی تاہم ندوۃ العلمانے اُس زمانہ کے مشہور اساتذہ (مثلاً مولنا لطف اللہ صاحب مولنا محمد فاروق صاحب مولنا احمد حسن صاحب) کی مدد و منظوری سے پوری بحث و جانفشانی

کے بعد نصاب تعلیم ترمیم کرکے ملک میں شائع کیا۔ ندوۃ العلماء نے
خیال کیا کہ اس حد پر پہنچکر اُس کا فرض ادا ہوگیا لیکن تجربہ نے
بتایا کہ صرف رہنمائی کافی نہیں چلنے کے واسطے سڑک بھی تیار
کرنی ہے اور چلنا بھی سکھانا ہے۔ اسی خیال سے ایک بڑے
دارالعلوم کے قیام کا ارادہ کیا گیا۔ اُس کی پوری شکل رسالہ کی
صورت میں شایع کی اور لکھنؤ میں خدا کا نام لے کر دارالعلوم
کھول دیا۔ گورنمنٹ عالیہ نے اراضی نزول کا ایک نہایت
خوش فضا اور ہموار قطعہ عطا کیا ہز ہائینس نواب صاحب
بھاولپور کی دادی صاحبہ نے پچاس ہزار روپیہ عمارت کے
واسطے مرحمت کیا لکھنؤ میں شہر سے دور ایک صحت بخش مقام
پر لبِ دریا آپ ایک شاندار عمارت دیکھیں گے جس میں اساتذہ اور
طلبہ نصابِ جدید کی تعلیم و تعلم میں مصروف ہیں قیام دارالعلوم
کے ساتھ ہی ندوۃ العلماء نے یہ بھی ارادہ کیا کہ قدیم کتابوں کے
جو سرمائے دست بُرد زمانہ سے بچ رہے ہیں وہ دارالعلوم میں
فراہم کرکے کتابخانہ قائم کیا جائے۔ چنانچہ کئی سال کی کوشش
میں ایک نادر ذخیرہ کتابوں کا فراہم ہو چکا ہے۔

جدید نصاب تعلیم کے اجرا میں گوناگون دقتیں پیش آئیں تاہم
مسلسل کوشش بیکار نہ رہی اور تلامذۂ دارالعلوم کا ایک خاصہ
گروہ ملک میں خداتعالیٰ کے فضل سے موجود ہے جو ذوق علمی کے
ساتھ تلاش و تحقیق کا شایق۔ کتابوں کا کیڑا نہیں بلکہ علم کا دلدادہ
ہے تقریر و تحریر پر پوری قدرت رکھتا ہے جن اہل علم نے دارالعلوم
کے فراغت یافتہ عالموں کی تحریریں دیکھی ہیں وہ کہہ سکیں گے

ع

ایں زمیں را آسمانے دیگر است

یہ زور تحقیق دوسری جگہ کمتر نظر آئے گا۔ دارالمصنفین اعظم گڈھ کا
ماہوار رسالہ "معارف" میرے دعوے کی بُرہان قاطع ہے۔
بارک اللہ فیہم۔ دوسرے عربی مدارس میں اگرچہ
ندوۃ العلماء کے اس مقصد سے مخالفت کی گئی لیکن جو
غائر نگاہیں تدریجی تغیرات کو جانچ لیتی ہیں وہ پکار اُٹھیں گی
کہ بڑی بڑی قدیم درسگاہوں کے نظام تعلیم میں ندوۃ العلماء
کی مثال نے تغیر عظیم پیدا کر دیا ہے میرے ایک ثقہ محترم
دوست نے ایک ایسے عربی مدرسہ میں ندوۃ العلماء کا نصاب تعلیم
اُستادوں کے پیش نظر پایا جہاں کوئی ندوہ کا نام بھی لینے کی
جرأت نہیں کر سکتا شکر ہے کام ہو رہا ہے نام نہ ہو تو نہ ہو

ع

مانمی خواہیم ننگ و نام را

ندوۃ العلماء کے نصابِ تعلیم کی خصوصیات یہ ہیں کہ معقول
کا غیر ضروری بار کم کرکے دینی علوم کو ترقی دیگئی ہے خصوصاً
علم تفسیر کو ادب پر بھی خاص توجہ کی گئی ہے تاکہ طلبہ میں مذاق
ادب پیدا ہو اور بقول مولانا فیض الحسن صاحب مرحوم کے
بے ادب نہ رہ جائیں عربی لکھنے اور بولنے پر قادر ہوں۔
فن تاریخ جو مسلمانوں کا سرمایۂ ناز ہے شاملِ درس کیا گیا ہے
جس سے طلبہ میں مورخانہ تحقیقات کا شوق پیدا ہو جدید
علوم سے بھی طلبہ واقف کئے جائیں جدید علم کلام پڑھایا
جائے تاکہ فلسفۂ جدید کے اعتراضات اور اُن کے مقابلہ
میں تائید مذہب کے طریقوں سے طلبا واقف ہوں بالآخر
عام اُصول یہ پیش نظر رکھا گیا ہے کہ طلبہ کے دماغ علمی مسائل
سے معمور ہوں محض ضمیروں کے مرجع اور اشاروں کے
مشارٌ الیہ سمجھنے اور ذہنی تشقیقات پیدا کرنے پر اُن کے
علم کا دارومدار نہ رہے بلکہ ایسے روشن اور معقول اُصول پیدا کئے

ذی فہم ان کے ضروری اور واجب العمل ہونے سے انکار نہیں کرسکتا ندوۃ العلماء نے اس رمز کو بھی سمجھا کہ تمام فنون کی تکمیل ناممکن ہے۔ لہٰذا انتہائی تعلیم میں نصاب ایسا تجویز کیا گیا کہ طلبہ اُس کو پڑھکر کسی خاص فن کی تکمیل کرسکیں۔ یہ ظاہر ہے کہ خداوند تعالیٰ نے انسان کی ذات میں مختلف قابلیتیں ودیعت رکھی ہیں اور ان قابلیتوں کا رجحان خاص خاص علوم کی جانب ہوتا ہے نصاب تکمیل کی تجویز سے یہ فائدہ عظیم حاصل ہوا کہ جو طلبہ جس علم سے مناسبت رکھتے ہیں اپنی پوری دماغی قوت اُس کی تحصیل میں صرف کرسکتے ہیں طلبائے عربی کی ماند و بود کا طریقہ بھی قابل اصلاح تھا اور اُس کا بُرا اثر جمعیت و شرافتِ نفس پر پڑتا تھا۔

اسی لئے ندوۃ العلماء نے دار العلوم کا جزو غیر منفک دار الاقامہ کو قرار دیا اور اُس کے آئین و ضوابط ایسے رکھے گئے جن سے طلبہ میں مردانہ اوصاف کو ترقی ہو یک جائی بود و باش باہم ربط و ہمدردی پیدا کرے اور ہمارے طلبہ ملک میں اتحاد و کشادہ دلی کا عمدہ نمونہ پیش کرسکیں۔ ندوۃ العلماء نے اس ضرورت کو بھی محسوس کیا کہ کیا بہ لحاظ ضرورت زمانہ اور کیا بہ لحاظ ایک علمی زبان ہونے کے انگریزی زبان کی تحصیل ضروری ہے۔

اس لئے یہ انتظام بھی کیا گیا ہے کہ جو طلبہ چاہیں انگریزی بطور زبان ثانی حاصل کرسکیں۔ یہ سُنکر آپ مطمئن ہوں گے کہ اس طرز تعلیم کی بدولت ندوۃ العلماء کے ایسے شاگرد موجود ہیں جنہوں نے علوم عربیہ کی تکمیل کے بعد یونیورسٹی کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی اور اب معزز تعلیمی عہدوں پر ممتاز ہیں یہ واقعہ بھی کم حسرت کے لائق نہیں کہ ندوۃ العلماء کے نصاب تعلیم کو مفید و کارآمد دیکھکر اُن شریف خاندانوں کے بچے (جو عربی مدارس کو خیرباد کہہ چکے تھے) ہمارے دار العلوم میں تحصیل علمی میں مشغول ہیں اس طرح آپ خیال کرسکتے ہیں کہ جو کام فرداً فرداً جدید و قدیم دونوں گروہوں کے امکان سے باہر تھا وہ ندوۃ العلماء کی کوشش سے پورا ہوسکا

ندوۃ العلماء کی مالی حالت کا بھی مختصر طور پر عرض کردینا ضروری ہے اس سال جو بجٹ شایع کیا گیا ہے اُس میں تخمینہ آمدنی مبلغ [illegible] درج ہے اس آمدنی میں گورنمنٹ عالیہ ریاستِ حیدرآباد بھوپال اور بہاولپور کے مستقل عطئے جائداد موقوفہ کی آمدنی وغیرہ شامل ہیں ایک مد خاص وظائف کی آمدنی کی ہے۔ جس میں بزرگانِ قوم غیر مستطیع طلبہ کے وظائف کے لئے چندہ عطا فرماتے ہیں۔ اس مد کی آمدنی کی تفصیل پڑھنے سے یہ مسرت ہوتی ہے کہ صوبہ مدراس کا قدم تمام صوبوں سے بڑھا ہوا ہے ندوۃ العلماء کا صیغۂ مال مجلس مال کے ماتحت ہے جلسۂ انتظامیہ کے ایسے ارکان جو مالی اُمور میں تجربہ و مہارت رکھتے ہیں اس مجلس کے ممبر ہوتے ہیں۔

موجودہ حالتِ ندوۃ العلماء کی ضروریات کی یہ ہے کہ عمارت دار العلوم کی تکمیل نہیں ہوئی۔ مسجد (جو مسجد نبوی کے نقشہ کے مطابق بننی تجویز ہوئی ہے) زیر تعمیر ہے۔

بورڈنگ کی اشد ضرورت ہے اس وقت طلبا درسگاہ کے بعض کمروں میں رہتے ہیں اور اس وجہ سے جو فوائد دار الاقامہ میں رہنے سے حاصل ہوتے ہیں وہ پوری طرح حاصل نہیں ہوسکتے جس نادر کتابخانہ کا میں نے ذکر کیا وہ اب تک دار العلوم سے دور شہر میں ہے اور اس طرح اُس کے فیض سے مدرسین و طلبا دونوں کماحقہ بہرہ یاب نہیں ہوتے بہرحال متعدد حیثیتوں سے ندوۃ العلماء کو اہل دل کی توجہ اور مالی مدد کی ضرورت ہے۔

میں خاتمہ میں خداوند علیم و حکیم کی بارگاہ میں دعا کرتا ہوں کہ یہ جلسہ بخیر و خوبی کامیاب ہو اور ملک و ملت کی ترقی میں اس کے آثار خیر و برکت ثابت ہوں

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ؁

یعنی حضرت امیر خسرو کے پہلے دیوان کی تاریخی تنقید

شاعر ماں کے پیٹ سے شاعری کا ملکہ لیکر پیدا ہوتا ہے وہ اس سے پیشتر شاعر ہوتا ہے کہ اُسے اپنے شاعر ہونیکا علم ہو سکے اُس کی فطرت میں شاعری کا آتش گیر مادہ ودیعت ہوتا ہے اور یہ مادہ ذراسی تحریک سے مشتعل ہو جاتا اور اُس کی نوآبخی کا باعث بن جاتا ہے۔ ناموافق حالات و حوالی شاعر کے فطری جوش کو نہیں دبا سکتا۔ باطنی قوت اُبھرتی ہے اور بالآخر خارجی قیود پر غالب آجاتی ہے:۔

امیر خسرو کے حالات سے شاعری کی اس عجیب و غریب ملکہ کی حیرت انگیز کیفیت ظاہر ہوتی ہے گردوپیش کے تمام حالات اور ظاہری اسباب ہر طرح ناسازگار تھے اُن کی رگوں میں ترکی اور ہندی خون تھا لیکن یہ شمشیر آزماؤں اور سورماؤں کا خون تھا۔ باپ لاچینی نسل کے ایک اَن پڑھ ترک سپہ سالار تھے جنھوں نے ساری عمر تلوار چلائی اور اپنی جان بھی تلوار ہی کے نذر کی۔ نانا راوت یعنی ذات کے چھتری تھے عہ جو نون صدی تک سلطنت کی فوج کے بخشی رہے کون کہہ سکتا تھا کہ سیف شمسی کا بیٹا اور عماد الملک راوت کا نواسہ جو پٹیالی کی جیسے کوردہ میں پیدا ہوا تھا۔ سلطان الشعرا طوطی ہند کہلائے گا اور دنیا اس کے کمال کے سامنے گردن جھکائیگی

کارخانۂ قدرت سر بسر اسرار نامتناہی سے گھرا ہوا ہے اسباب و علل کی عقدہ کشائی پر ہماری دسترس نہایت محدود ہے عقل و وہم کے لئے اُن قوانین کی تہ تک پہنچنا خارج از امکان ہے جو دنیا کی بڑی ہستیاں اس نامعلوم طریقہ پر پیدا کرتے ہیں:۔

جس دن سے امیر خسرو کو یارائے گویائی ہوا اُسی وقت سے شعر زبان پر جاری ہونے لگے وہ الشعراء تلامذ الرحمن کسی کی تربیت درکار نہ تھی فطرت کی رہبری میں ارتقائے ذہنی کے مراحل خود بخود طے ہو گئے۔

دیباچۂ تحفۃ الصغر میں کہتے ہیں:۔

عہ تعجب ہے کہ آج تک کسی مورخ اور تذکرہ نویس نے اس کا ذکر بھی نہیں کیا کہ امیر کی رگوں میں ہندی خون بھی شامل تھا خود امیر نے بھی کھلے لفظوں میں ایسے کہیں نہیں بیان کیا البتہ اپنے آپکو ترک ہندوستانی تو کبھی کبھی لکھا ہے لیکن بیشتر آبائی نسبت سے خسرو لاچین لکھتے ہیں غرہ کے دیباچہ میں جہاں نانا کا ذکر کیا ہے وہاں راوت کا لفظ ایک جگہ اُن کیلئے لکھا ہے دوسری جگہ عماد الملک کے نام کے ساتھ راوت لکھا ہے (دیکھو فیروز شاہی) یہ لفظ اس عہد کی تاریخوں میں بہت متداول ہے اور امیر نے اسے بارہا استعمال کیا ہے مثلاً قران السعدین میں ایک جگہ لکھتے ہیں ع راوت شدہ صد تن خار اشکاف۔ قران السعدین کے ایک شارح نے لکھا ہے چھتریوں یعنی راجپوتوں میں جو فوج کے سردار ہوتے تھے ان کی قوم کیلئے یہ لفظ مستعمل ہوتا تھا۔

چوں مرا استادے سرآمد بر سر نیامدہ بود کہ بر سر
دقائق دال شدے و آہوئے مشکبار قلم مرا از سواد
خطا بازآوردے ...... چوں طوطیانِ نوآموز
آئینۂ تخییل را پیش داشتم و از خیالے کہ در تصور می
سخن می آموختم۔ یک چند آئینہ دل آہنی بصیقلہ کوشش
زدودم .... و مجلداتِ استاداں را بپوست در رفتم
کار حلاوتے بحاصل آمد و لذتِ سخن کامگار گشت"

اپنی اس وہبی استعداد سے وہ خود بھی متحیر تھے:۔

حیرانِ طبع خودم ...... بارہا از موج تخیل در بحرے
افتم کہ کالِ غوراں نیابند، و بے آنکہ غور کند بارے بجے
برم از بحر سخن چنداں لآلی غلطاں و آبدار در مشت تخیل
گرد می آید کہ گرد نمی تواند آورد" (دیباچہ بقیہ نقیہ)

اور بچپن ہی میں فخر کا حق حاصل ہو گیا تھا ع

سلطانے سلطان سلاطین کمال است
(تحفۃ الصغر)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

در قرانہا نظیرہ سلطانی ÷ زیر مضیق خراب نتواں یافت
(تحفۃ الصغر)

اپنی نکتہ سنجی پر دوسری جگہ اس طرح ناز کیا ہے ؎

از زبانِ کلکِ من سواد جہاں
در دل لولوئے عمانی غدہ ہست
(تحفۃ الصغر)

صغر سنی اور طفولیت کا زمانہ مشق کا زمانہ تھا اس زمانہ میں
انہماک و توغل کی انتہائی حالت کو انھوں نے خود بیان کیا ہے

سِن بوالہوس خود بہوس طبعی خود چناں راغب
آں بر غائب غرائب بودہ ام کہ شام تا صبح
چوں قلم فرو کردہ دود چراغ می خوردم و شب و روز
سواد بیاض را نقش دیدہ ساختہ ..... ہر جا کہ نظمے
چو آب زر می دیدم عاقبت جوابے رواں می کردم
و ہر دیوانے کہ ناظر شدم ہمبراں سیاقت تقریر بہ تحریر
رسانیدم (دیباچہ تحفۃ الصغر)

ارتقائے ذہنی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ جانے پر ان کی نظر میں بچپن کا کلام کیا ہیچ سکتا تھا وہ اسے محفوظ رکھنا نہ چاہتے تھے لیکن اپنے مخلص بھائی تاج الدین زاہد اور احباب کے اصرار پر نظر ثانی کے بعد صغر سنی کے اخیر چند سالوں کا کلام انتخاب کر کے تحفۃ الصغر میں یکجا کر دیا۔ انہیں اس وقت خیال بھی نہ ہوا ہوگا کہ مورخ اور عالم علم النفس کے لئے ان کی تمام تصانیف میں سب سے زیادہ دلچسپ یہی مجموعہ ہے جس سے اس تعجب انگیز استعداد شاعری کا اظہار ہوتا ہے جو بدو شعور سے ان کی رفیق حال تھی عالم طفلی کے معمولی حرکات و سکنات سے بھی معنی خیز نتائج مستنبط ہوتے ہیں اور نفسِ انسانی کے دقیق اور عمیق اسرار پر روشنی پڑتی ہے۔

بچوں کو کھیل کود کے طور پر الٹی سیدھی لکیریں کاڑھنے اور ٹیڑھے مکوڑے بنانے کا شوق ہوتا ہے نفسیات کا مبصر ان نقوش اولین سے ملکاتِ ذہنی کا پتہ لگاتا اور مشاہدہ و ادراک اور تخیل و اختراع کی قوت کا اندازہ کر لیتا ہے ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ خسرو نے صرف سولہ سے بیس برس تک کا کلام محفوظ رکھا اور باقی کو اس قابل نہیں سمجھا کہ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے کیا اچھا ہوتا کہ ہم ان اشعار سے بھی لطف اندوز ہو سکتے جن سے مکتب میں مشق خط کے بہانے مشق سخن ہوتی تھی یقین ہے کہ ان نقوش اولین میں بھی خسرو کے خط و خال صاف نظر آتے۔ امیر نے بیس برس کی عمر تک اپنی

ع دیباچہ تحفۃ الصغر۔

شاعری کا بچپن قرار دیا ہے جس شخص نے ستر برس شاعری کی اور اخیر دم تک قلم ہاتھ سے نہ رکھا بیس برس تک اُس کی شاعری کا بچپن ہی سمجھنا چاہئے لیکن یہ یاد رہے یہ وہ بچپن ہے جو دوسروں کے عہد کمال سے ٹکر کھاتا ہے۔

سولہ برس کی عمر میں جس زمانہ سے تحفۃ الصغر کا کلام شروع ہوتا ہے خسرو کو تمام اصناف شعر پر دستگاہ حاصل ہو چکی تھی "سلطانی" ان کا ابتدائی تخلص ہے اور تحفہ میں بیشتر قصائد اور بعض غزلیات اسی تخلص کے ساتھ ہیں اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دوسرا تخلص "خسرو" غالباً سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں اختیار کیا۔

امیر کی ولادت ناصر الدین محمود (۶۴۴ھ تا ۶۶۴ھ) کے عہد میں ۶۵۱ھ میں ہوئی تھی ان کی پیدائش سے تیرہ برس بعد محمود کا انتقال ہو گیا اور غیاث الدین بلبن تخت نشین ہوا اور بائیس برس تک (۶۶۴ھ تا ۶۸۶ھ) اس نے نہایت جاہ و جلال کے ساتھ حکومت کی۔ تحفہ کا کلام عہد بلبن کے تیسرے چوتھے پانچویں اور چھٹے سالہائے جلوس یعنی ۶۶۷ھ لغایت ۶۷۱ھ میں لکھا گیا۔ عہد ناصری کی کوئی نظم اس میں بظاہر شامل نہیں ہے۔

امیر کا یہ زمانہ پوری آزادی کا تھا جو بعد میں پھر میسر نہیں آیا باپ کا انتقال تو سات ہی برس کی عمر میں ہو چکا تھا۔ خوش نصیبی سے نانا زندہ تھے انھوں نے باپ کے برابر سرپرستی کا حق ادا کیا۔ انیسویں یا بیسویں برس[1] ایک سو تیرہ برس کی عمر میں ستر سال نہایت عزت کے ساتھ عارض ممالک رہنے کے بعد اُن کا بھی انتقال ہو گیا۔

تحفہ میں اُن کے مرثیہ میں ایک پر درد ترجیع بند موجود ہے اُن کی انتقال پر امیر کا اشکبار ہونا بجا تھا۔ باپ کا غم تازہ ہو گیا دنیا میں کوئی سرپرست نہ رہا اور تلاش معاش کی فکر دامنگیر ہوئی آہ اسی دن اُن کی بچپن اور آزادی کا زمانہ ختم ہو گیا۔ کس درد کے ساتھ نانا کو مخاطب کر کے کہا ہے ؎

خسرو کہ یار بد ز بقایت بزرگ اُمید
امسال چو بجان غمش کرد ہمچو بید

تحفۃ الصغر میں سلطان غیاث الدین اور ولی عہد سلطنت "نصرۃ دین قاآن ملک" سلطان محمد کی تعریف میں ترجیع بند اور قصائد ہیں اور حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کی منقبت میں ایک بہت عمدہ ترجیع بند ہے جس کی تشبیب خاص طور پر قابل لحاظ ہے ؎

شاہ نوروز در وں آمدہ در شہر صیام
اے دریغا کہ نشاط است دریں شہر حرام

دربار بلبن سے براہ راست امیر کا کبھی ذاتی تعلق پیدا نہیں ہوا اور شاہزادۂ مذکور سے اس زمانے سے نو دس برس بعد روابط قائم ہوئے تحفہ میں محض مشق و طبع آزمائی کے لئے بطور خود مدح سرائی کی ہے لیکن بارگاہ مرشد سے رابطۂ خلوص اسی زمانہ

---

[1] دیباچۂ غرہ[2] اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ دیباچہ غرہ میں بیس برس لکھے ہیں لیکن چونکہ تحفہ میں انیسویں برس تک کا کلام ہے اس لئے انیسویں برس زیادہ صحیح ہے[2] دیکھو دیباچۂ غرہ تاریخ فیروز شاہی مصنفہ ضیاء برنی میں جو خسرو کا معاصر ہے امرائے عہد بلبنی میں عماد الملک راوت کا مفصل حال لکھا ہے۔

میں قائم ہوا۔ حضرتِ محبوبِ اولیاء قدس سرہٗ کا سنہ ولادت باختلافِ روایات ۶۳۳ھ یا ۶۳۴ھ ہے اس طرح وہ امیر سے سولہ سترہ برس بڑے تھے ترجیع منقبت کے ایک شعر میں اپنا تخلص سلطانی کے بجائے خسرو اختیار کرنے کی اجازت طلب کی ہے اور یقین ہے کہ مرشد کا شرفِ قبول حاصل ہونے کے بعد یہ تخلص خلعتِ دوام سے سرفراز ہوا

یا بر از خاک درت تاج قبول اندر سر
خسروے گردد بر ملکِ سخن سلطانی

چونکہ منقبتِ شیخ میں صرف یہی ترجیع اور ایک دو رباعی اور قطعہ اس دیوان میں پائے جاتے ہیں اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ امیر کا تعلق شیخ سے غالباً ۶۷۱ھ کے قریب ہوا مدحِ شیخ میں جو رباعی لکھی ہے اُس کے ایک ایک حرف سے اُس عقیدت اور خلوص کا اظہار ہوتا ہے جو تقریباً ساٹھ برس تک امیر کو اپنے ہادیِ طریقت کے ساتھ رہا اور جو فنا فی الشیخ کی حد تک پہنچ گیا تھا۔

رباعی

گر پاک شود دیدۂ من ز آلائش
اندر تہِ پائے شیخ سازم جائش
حاجت نبود کہ دیدہ را پاک کنم
خود پاک شوم چو مالم اندر پائش

تحفۃ الصغر

اس زمانے میں دیباچہ کو چھوڑ کر خود امیر کے اس زمانے کے ذاتی حالات پر سب سے زیادہ روشنی تحفہ کی مثنوی ڈالتی ہے جو اُنکی جدتِ طبع کا نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ یہ مثنوی جس میں تقریباً ایک دو سو شعر ہیں اُس زمانے کی ہے جب تخلص سلطانی تھا اور کلام کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سولھویں سترھویں برس میں لکھی گئی تھی اس مثنوی کے واقعات پر غور کرنے سے مجھے معاً یہ گمان ہوا تھا کہ اس میں پٹیالی کے جو امیر کا مولد ہے حالات لکھے ہیں لیکن بظاہر تمام مثنوی میں پٹیالی کا لفظ کہیں موجود نہ تھا ایک مدت تک بعد جب میں یہ شعر پڑھ رہا تھا ؎

گر نہ ایں از قضائے یزدانیست
بیتیالی چہ جائے سلطانیست
جائے من بود قبلۃ الاسلام
قبلۂ خسروانِ ہفت اقلیم

معاً یہ گمان ہوا جو بعد میں یقین سے مبدل ہو گیا کہ شعرِ ثانی کے مصرعۂ اولیٰ میں قبلۃ الاسلام درحقیقت قبۃ الاسلام ہے جس سے امیر اور اُن کے معاصرین مصنفین کی مراد دہلی ہے جو اس زمانہ میں اس لقب سے موسوم تھی اور پہلے شعر میں ناواقف کاتبوں نے بتیالی (یعنی پٹیالی کو بتیالی سمجھا ہے اور دونوں لفظوں کے رسم الخط میں اس قدر مشابہت قریبہ پائی جاتی ہے کہ اس غلطی کا کوئی بڑا الزام بیچارے کاتبوں پر عاید کرنے کا موقع نہیں ہے۔ مثنوی کے مضامین کا خلاصہ یہ ہے کہ امیر جورِ فلک کا شکوہ کرتے ہیں کہ پورے ایک برس سے دہلی چھوڑ کر پٹیالی پڑے ہوئے ہیں یہ ایک مستحکم قلعہ ہے جہاں جاہل اور جنگجو افغانوں کا دخل ہے افغانوں کو چھوڑ کر باقی سب مفلوک الحال سپاہی بستے

ایک قصیدے میں جو اغلباً بلبن کی مدح میں ہے فخر کرتے ہوئے اپنے دونوں تخلصوں کو جمع کیا ہے ایک شعر میں ؎ خسروا در عہدِ تو سلطانِ سخن خسرو ولا چین سلطانی شدہ است ایک دوسری جگہ کہتے ہیں ؎ از حد گذشت خسرو سلطانی ایں بساط۔ یہ اور اسی قسم کا باقی کلام اس زمانے کا ہے جب جدید تخلص اختیار کیا تھا لیکن ابتدائی تخلص بطورِ یادگار کے ہوا تھا یہ کلام سلطانی اور خسروی سلسلے کی بیچ کی کڑی ہے۔ ضیائے برنی نے لکھا ہے کہ سلطان بلبن نے دو آب پر تسلط حاصل کرنے کے بعد حفاظت و انتظام امن کیلئے پٹیالی میں حصار تعمیر کیا تھا اور اس میں افغانوں کو بسایا تھا (فیروز شاہی)

ہیں جب پیسہ سالانہ کی آمد پر طرح طرح سے اپنی ناداری کا دکھڑا روتے اور قصابوں کے مظالم کی شکایت کرتے ہیں۔ امیر خسرو خود بھی زمرۂ سواران میں شامل ہیں اور تنخواہ اور مدد معاش کا جو غلہ آتا ہے وہ اُن تک پورا نہیں پہنچتا افغان بیچ میں خورد برد کر جاتے ہیں رات کو پہرہ پر جانا پڑتا ہے جب تھکے ماندے گھر پہنچتے ہیں تو مچھر ستاتے ہیں انہیں اس جگہ سے دلی نفرت ہے اور سخت وحشت ہوتی ہے دارالسلطنت کے دل فریب مناظر اور ارباب علم و ہنر کی صحبتیں یاد آتی اور رہ رہ کر دل سوستی ہیں:۔

منکہ میلم بہ صحبت ظرفاست ۔۔۔ با چنیں قوم زشت باید خاست
طوطی کز سخن شکر باشد ۔۔۔ باکلنگان و سارچوں باشد
مدتے ہیں حصن برکشیدہ بماہ ۔۔۔ سالے و زدیم زر روز تباہ
کہ اگر ذرہ منہند بہ کوہ ۔۔۔ کوہ آید زبار آں بہ ستوہ

(مثنوی تحفہ)

ٹپیالی میں صرف دو شخص اُن کے ہمدم ہیں ایک ابوالمحامد علاؤالدین محمد محمود اور دوسرے بختیار شکرہ داران رفقا کے ساتھ دل بہلانے کے لیئے کبھی گنگا کی طرف یا صحرا کی جانب نکل جاتے ہیں اور اشعار خوانی سے غم غلط کرتے ہیں ایک پیدائشی شاعر کے لئے ایک ایسے مقام پر جہاں عراقی دلچسپیاں مفقود تھیں قدرت کے دلکش مناظر رفیق وقت تھے

گہ ز اندیشۂ سینہ لاشویم ۔۔۔ بانگکے یا ترانۂ گوییم
گہ خرامیم جانب صحرا ۔۔۔ کہ برد سبزہ ہا ز دل سودا
گاہ گردیم سوے گنگ چناں ۔۔۔ کہ غم از دل بشوید آب رواں

ہمچناں می برم در تب و تاب ۔۔۔ عمر خود در کرانہ بر لب آب

(مثنوی تحفہ)

اسی دوران میں باران بہار شروع ہو جاتا ہے امیر اُسے فال نیک سمجھکر بیداربختی کی تعبیر دیتے ہیں اور اپنے ممدوح اختیارالدین عیسٰی کی خدمت میں یہ سرگزشت بامید دادرسی بھیجتے ہیں۔

یہ مثنوی اس زمانے کی ہے جب تک انھوں نے خسرو تخلص اختیار نہیں کیا تھا یعنی عمادالملک کا ابھی تک انتقال نہیں ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس مثنوی میں امیر نے شاعرانہ ستم ظریفی سے کام لیا ہے اور بعض حالات کے بیان میں ظریفانہ مبالغہ کیا ہے ورنہ ہم کو تعجب ہوتا ہے کہ اپنی جس تہی دستی اور بیچارگی پر اس طرح اشکباری کی ہے سہ

من کہ از زمرۂ سوارانم ۔۔۔ از تہی دستی اشک بارانم
خدمت سخت درمیاں نانے ۔۔۔ کندہ باید بدیں صفت جانے

وہ امیر کو عمادالملک کے حین حیات میں کیونکر پیش آئے۔

ہمیں تو صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ اپنی مرضی کے خلاف انہیں ایک برس تک ٹپیالی میں رہنا پڑا تھا اور چونکہ طبیعت دارالسلطنت کی دلچسپیوں کی عادی ہو چکی تھی اس کورده میں انہیں ایک ایک گھڑی پہاڑ تھی۔ اس شیوۂ بیانی کا ماحصل صرف اسی قدر ہے کہ ماموں جان ہمیں دہلی بلا لیجئے ٹپیالے میں جی نہیں لگتا۔

حقیقت یہ ہے کہ خاندانی اور ذاتی تعلقات کی وجہ سے امیر کا اکثر زمانۂ حیات دہلی میں گزرا اور شروع ہی سے دہلی اُن کیلئے بمنزلۂ وطن کے ہو گئی تھی۔

ع قدرتی مناظر امیر کے دل پر بہت گہرا اثر کرتے تھے مناظر کی تصویر انھوں نے بہت جگہ کھینچی ہے اور اس طرح کھینچی ہے کہ پڑھنے والا دیکھتا رہ جاتا ہے اس مثنوی میں جہاں برسات کا سماں باندھا ہے [illegible] ظاہر ہوتا ہے کہ جزئیات فطرت کے مطالعہ کو اور اس کی مصوری کا ملکہ ابتدا ہی سے اُن میں کس قدر موجود تھا۔ عمدہ اختیارالدین امیر کے ایک ماموں کا نام تھا جو فوج میں ایک معزز عہدے پر [illegible]

اس مثنوی میں باوجود اس کم سنی کے امیر نے بیانِ واقعات فطرت نگاری شوخی و جدت کا بہت بڑا کمال دکھایا ہے افغانوں اور قلعہ کی ہجو بڑے جوش کے ساتھ کی ہے سپاہیوں کی تباہ حالت کا نقشہ اور اُن کی زبانی اُن کی بدحالی کا شکوہ سپہ سالار کے روبرو بڑا موثر ہے دارالسلطنت کے مناظر کا بیان اور بارانِ بہار کی کیفیت بہت دل پسند پیرایہ میں لکھی ہے۔

جس زمانہ میں امیر نے یہ مثنوی لکھی ہے دہلی کو فتح کئے ہوئے مسلمانوں کو کوئی اسی برس گزر چکے تھے۔ ایبک اور التمش کے زمانے میں مسجد قوۃ الاسلام اور قطب مینار تعمیر ہو چکے تھے۔ حوض سلطانی بھی التمش کی یادگار تھا۔ مینارے اور حوض کا ذکر مثنوی میں اس طرح کیا ہے:۔

بحر صد چشم در نظارۂ اُو	مہر مبخوتی از منارۂ اُو
کاہش در بلند پروازی	کرد با زلف مہ رسن سازی
حوض سلطان ز روشنائی و رنگ	سیم محلول بخستہ بسنگ

(مثنوی تحفہ)

ایک قصیدے میں جس میں بلبن کی صحت یابی کی مبارک باد ہے اور جشن عام کا بیان لکھا ہے "کوشک لعل" کا ذکر بھی کیا ہے ؎

ز کوشک لعل چو بنمود روئے را بنمود	شہ سپہر ز میدانِ سبز رش استقبال

خاندانِ غلامان کے ترک سلاطین کا مستقر یہی قصر تھا جو چھتر کے اندر دارالسلطنت کے کسی مناسب موقع پر بنا ہوا تھا بلبن کے رنگیلے جانشین کیقباد (۶۸۶ھ تا ۶۸۹ھ) نے جو سلسلہ غلامان کا آخری تاجدار تھا۔ قدیم دارالسلطنت کے محل وقوع سے ہٹ کر کوئی چھ سوا چھ میل شمال مشرق کی جانب قصر کیلوکھری تعمیر کیا اس کے بعد تو پھر گویا ایک رسم قرار پا گئی کہ جو نیا بادشاہ ہوا اور وقت نے ساعدت کی چہرک نے قدیم مرکز حکومت کے قریب نیا کوشک بنوایا اور نیا دارالسلطنت قائم کیا۔ جلال الدین خلجی نے حصار کیلوکھری کی تکمیل کی علاؤ الدین اور قطب الدین نے سیری میں دارالخلافہ تعمیر کیا۔ غیاث الدین تغلق نے تغلق آباد بنوایا غرض امیر کے سامنے پچاس برس کے اندر دہلی کا پھیلاؤ کہیں سے کہیں پہنچا۔ اللہ اللہ آج کھنڈروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا نہ کوشک لعل کا نام و نشان باقی رہا نہ طبل شاہی کی آواز ہے ؎

ز طبل شاہی آواز ہا کہ برخاست	بشرق و غرب ہمی رفت تیغ وبال و شمال

(تحفہ)

بقیہ صفحہ سابقہ: پھر فرماتے ہیں مطلعیات کے ایک قصیدے میں ان کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎ نخست خال بزرگ اختیار دین کہ بنام مسند است کز نام محمدت والا؛ ابتدا میں مجھے ان کے نام کے متعلق غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی اور میرا یہ خیال تھا کہ اس نام سے اختیار الدین کشلی خاں عرف ملک چھجو مراد ہے جو سلطان بلبن کا بھتیجا تھا جس کی ملازمت امیر نے نانا کے انتقال کے بعد اختیار کی تھی امیر کے ماموں اور ملک چھجو کے علاوہ امیر کے ایک دوسرے مربی علی بن ایبک (حاتم خاں) کا لقب بھی اختیار الدین تھا امیر کی تصانیف میں اسما اور القاب کی تطبیق میں نہایت احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے ایک ہی لقب سے مختلف زمانوں میں مختلف ممدوح موسوم پائے جاتے ہیں اس لئے امیر کے حالات اور عہد کی تاریخ پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ تطبیق میں مغالطہ نہ ہو۔ تحفہ کے زمانۂ تصنیف سے کوئی پندرہ سولہ برس بعد ملک ایبک سے تعلقات پیدا ہوئے علاوہ ازیں اکثر جہاں اختیار الدین سے مراد کشلی خاں یا حاتم خاں ہیں وہاں امیر نے ان کا نام بھی لکھا ہے۔

عروس البلاد کے جشن و نشاط عام کی ایک کہانی رہ گئی ہے ؎

بروز جمعہ بیارا ستند ہمچو عروس

برائے شاہ جہاں شہر را بزیور و مال (تحفہ)

یہ امر نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اس عہد میں جسے مورخین جاہل غلطی سے عہد افغانیہ یا پٹھانوں کا زمانہ کہتے ہیں سلطنت پر ترکوں کا تسلط تھا اور عنانِ حکومت تمام تر سلاطین و امرائے ترک کے ہاتھ تھی امیر نے افغانوں کا اور بھی کئی کتابوں میں ذکر کیا ہے لیکن اس طرح جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں ان کی حیثیت میں کسی قسم کا سیاسی امتیاز یا تفوق پیدا نہ ہوا تھا۔ جہاں فوج میں سلطنت کی مختلف نسلوں اور متفرق ملکوں کے سپاہی نوکر تھے وہاں افغان بھی تھے اور بلاشبہ اپنی شہرہ پشتی اور جنگجوئی کی وجہ سے اچھے سپاہی سمجھے جاتے تھے تاریخ کا یہ عہد خالص ترکوں کی حکمرانی کا عہد ہے اور اس سے بڑھکر کوئی غلطی نہیں ہو سکتی کہ اسے افغانوں کا زمانہ کہا جائے جن کا تاج و تخت میں کوئی حصہ تھا نہ خاص سیاسی اہمیت حاصل تھی:۔

اس مقدمہ کے ختم کرنے سے پہلے تحفہ کی ایک نمایاں خصوصیت پر نظر ڈال لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ تمام اساتذہ نے خسرو کو صنائع اور بدائع کا بادشاہ لکھا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ لفظی و معنوی صنعتوں سے اُن کی طبیعت کو خاص لگاؤ تھا ذہنی ترقی کے بعد اُنہیں معلوم ہو گیا تھا کہ سچی شاعری کا بڑا حسن سادگی اور جذبات میں ہے اور یہ سب تکلفات لاحاصل ہیں۔ اسی وجہ سے جوں جوں عمر ترقی کرتی گئی اُن کا کلام بتدریج اس قسم کے خس و خاشاک سے پاک ہوتا گیا۔ بعد میں صنائع بدائع کا تمام التزام امیر نے نثر کے لئے مخصوص کر دیا تھا اور سارے تکلفات اس کی آرائش میں صرف کرتے تھے تحفہ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہو گا کہ اگر مذاق سلیم رہبری نہ کرتا تو امیر کی شاعری کے لئے یہ بڑا خطرہ تھا سارا دیوان صنعتوں سے بھرا پڑا ہے اور کہیں تو اس قدر بھرمار ہے کہ بعد میں وہ خود جب ان چیزوں کو دیکھتے تھے تو ہنستے تھے اور بچپن کی خام طبعی کہکر معذرت کر دیتے تھے۔

ایک قصیدہ ۳۷ اشعار کا شہابِ مہمرہ کے اتباع میں لکھا ہے اور ہر بیت میں مور و مو کا التزام ہے ؎

شہابِ مہمرہ در مور گفتہ است خوب تر شعرے ؛
؛ دل چوں مور من نیز از قضا سفتہ آں قدر موے
چو من مورے کجا موئے بخاک پائے او ماند ؛
؛ چہ مردانِ اسد بازے چہ ہم سنگ گہر موئے
ولیک از راہِ گستاخی بہ مور و موئے آورد م ؛
؛ ہزار از مور طبعم تیز زیں ساں پرورد موئے

ایک قصیدے میں روئے و موئے ماہ و مہر اور شانہ و آئینہ کا التزام ہے بڑی موشگافیاں کی ہیں ہر شعر میں یہ چھ لفظ نبھائے ہیں۔ تقریباً چالیس شعر لکھکر دم لیا ہے تشبیب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اے ماہ بستہ روئے تو مہر اندر آئینہ
موئیت زشانہ ریختہ عنبر بر آئینہ

مہ امیر خسرو سے پہلے ساتویں صدی ہجری کے مصنف دل ہیں شہاب مہمرہ بدایونی مشہور شاعر تھے امیر خسرو نے ایک جگہ شہاب مہمرہ کا مطلع ذکر کیا ہے ۔ ع بداؤن مہمرہ مست برخیزو زخواب بنگر بر [illegible] غلغل [illegible] شیخ عبد القادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں شہاب مہمرہ کو رکن الدین بن سلطان التمش کے عہد کے شعرا میں شمار کیا ہے اور [illegible] قصیدہ اسی صنعت سے نقل کیا ہے جس میں [illegible] ایک بیت یہ ہے جس میں مہر و مو کا التزام ہے قصیدہ کا مطلع شروع [illegible] انشا [illegible] دانم موئے [illegible] ہیں و [illegible] حق [illegible] ہیچو مدم نیابد [illegible] (بدایونی صفحہ ۲۲ مطبوعہ کشوری)

بفشاند مشکِ موئے تو از شانہ گرد ماہ ؞
بنمود عکس روئے تو مہر اندر آئینہ

گریز

از بہر موئے و روئے تو اے شاہِ مہرباں ؞
؞ گرد در دستِ شانہ و از خنجر آئینہ

آں شاہ بہر تیغ علاء دول کہ ہست ؞
؞ در موش ماہ شانہ بروش اختر آئینہ

موئے اگر ز شانہ دہد ماہ را بہ مہر ؞
؞ مہ را کشد چو روئے وے اندر بر آئینہ

اپنی موشگافی کا ذکر۔

خسرو ز روئے موئے شگافی چو شانہ گشت
در مدحت ز مہر بہت در خور آئینہ

دعا

میخور بجام مہر و مہ از ساقیٔ کہ کرد
مویش چو روئے شانہ پر از عنبر آئینہ

چوں موبجنگ شانہ اسیر تو مہر و ماہ
وز روئے تو بدہر ضیا گستر آئینہ

از دست بخت شانہ دولت بروے تو ؞
وز مہر و مہ بروے تو تا محشر آئینہ

اس کے علاوہ کسی قصیدے کے قافیہ میں ناخن کا کسی میں انگشت کا کسی میں کمر کا کسی میں آئینہ کا التزام کیا ہے ایک قصیدے کی تشبیب میں معشوق کا سارا سراپا صنعت کے قلم سے کھینچا ہے مطلع ہے۔

فرق تو از طریقِ فسوں سازی اے نگار
آوردہ راہ مور پدید از دہانِ مار

حق یہ ہے کہ خوب اشعار نکالے ہیں۔ ابرو کا ذکر دیکھئے۔

ابروئے تو کہ سخت بلند است چوں کماں
پیوستہ تا بگوش نکش بہر کارزار

جفت ابروئے ترا نہ سزد عقدہ درمیاں
بے عقد اگرچہ جفت ندیدیم ساز دار

در چشم جادوئے تو ز اعجاز جادوئے
با روز تیرہ گشتہ شب روشن است یار

در دو ستارۂ تو بہر ار نظر کنم
یک تیر غمزۂ تو دو چشم کند چہار

ہینتالیس شعر میں سراپا لکھا ہے اور گریز کے صرف دو تین شعر میں مدح ختم کر دی ہے پھر مطلع ثانی لکھکر تشبیب بہار شروع کی ہے اور پینتیس شعر بہار کے لکھکر صرف تین شعر میں گریز و مدح ہے جزو ثانی میں سلطانی اور جزو اول میں خسرو تخلص ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں درصل ایک وقت نہیں لکھے گئے بہار کے بیان میں وہی فطرت نگاری اور حقیقت طرازی ہے جس کی ایک پیدائشی شاعر سے توقع کی جاتی ہے

ابر از برائے تہنیت گلشن ربیع ؞
؞ کرد آستینِ سبزہ پر از دُر شاہوار

بہمن بر آنکہ زود زند تیر بر خزاں ؞
؞ از شاخ سرو یافت کماں چوں سفندیار

بیدست بر کشادہ سناں بر سیاہ وے ؞
؞ بادست باز دادہ عناں را برا ہوار

پیکانِ غنچہ گشتہ ز سوہان باد تیز ؞
؞ گلہا سپر کشیدہ بسر بہر کارزار

داد آسماں زمینِ کہن را قبائے نو ؞
؞ زد گلستاں نشانۂ وہے با خدنگ خار

صد نقش بست یادِ شمالی بروئے آب ؛
؛ صد رنگ ریخت رنگ ریاحین زدو با
چوں باد بر سر آمد سلطانِ غنچہ را ؛
؛ از ننگِ خار جائہ تنگ کردہ پارہا
پھولوں کی بہار دیکھئے ؎
گلہائے کوزہ بر صفت کاسہائے سیم
پُر کرد خوانِ زر زرِ خالص کناں نثار
از کاس لالہ خورد مگر برگ کوزہ مے ؛
کافتد بہر طرف چو حریفاں بادہ خوار
از بس کہ خونِ لالہ بہ گردن گرفت کوہ
بالش بہ گل بماند سرش گشتہ سنگ سار
صد برگ برکشاد درِ ناز بر قفاش ؛
بیروں کشید خنجر بیداست روزگار
داند بنفشہ کو تہی عمر گل از انکہ ؛
خم قامت و کبود لباس ست سوگوار
مولیست سر بسر تنِ سنبل و زین قبل ؛
موئے نمی برد ز سر زلف غم گسار
گنج زر است در دہنِ نرگس خراب
شک نیست گنج را بہ خرابی بود مدار
صد برگ راز پردۂ عصمت بروں فگند
سوری چو دور کرد ز بالائے سر خمار
بالش گرفت خسرو گل بر سر یر شاخ
پس از دہاں بخند بروں ریخت بر کنار
یک پا ستادہ گرد سرش چوں سلامیاں
سرو کماں کشیدہ او شد سناں گزار

گسترد باد فرش ریاحین بروئے خاک
افگند باغ نطع بساطین شاخسار
بلبل کہ ہست حاجب خاص ازادائے فضل
جاں از شگوفہ برد و دل خستہ از شمار
مرغانِ باغ راپس ازیں درسِ نو دھد
سلطانی از ثنائے سلیمان روزگار

سبحان اللہ اس تشبیب کو دیکھئے اور ذرا شاعر کی صغر سنی کا خیال کیجئے سچی شاعری کے یہی جوہر تھے جو خسرو کے ہاں ابتدا ہی سے نمایاں تھے اور جن کے مقابلہ میں تصنعات کو زیادہ فروغ پانے کا موقع نہ ملا اگر خدانخواستہ طبیعت بالکل ادھر کی ہو کر رہ جاتی تو کیا حال ہوتا؟ خسرو سے بڑھ کر کسی کے لئے یہ خطرہ تھا اسی زمانہ میں جہاں ان کی سچی شاعری کے نمونے بھی کافی موجود ہیں محض لفظی تصنعات کی طرف نسبتاً زیادہ التفات معلوم ہوتا ہے۔ ایک قصیدہ ہے جس میں لفظی الٹ پھیر ہی میں تیس شعر لکھ ڈالے ہیں۔

مشتے نمونہ از خروارے
چند اشعار ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے نقل کئے جاتے ہیں ؎

بر عارضِ خوبت چہ کنم عرض عرایضہ
از چشمۂ ہر چشم چشمۂ دیگر
مشہور بہ شہرم ز تولے شہرۂ صد شہر
ہمچوں کرم از مکرمتِ مکرم کشور
محمود محمد فرود در خورد محامد ؛
پور عرض عرض عرض علی عنہ بہ

از نگاہش گرگاہ شود پیشش شکوہش — فرقدِ فرق شدہ برسرِ فرقد
معزول بوقار ار شود آں ذات موقر — شعرم ز شعارش شدہ از شعری برتر

سید حسن برنی

تجرید

ہر دل کہ درو مایۂ تجرید کم است — بیچارہ ہمہ عمر ندیم ندم است
جز خاطر فارغ کہ نشاطے دارد — باقی ہمہ ہر چہ ہست اسباب غم است (عمر خیام)

اکثر الفاظ بعض دفعہ غلطیوں کا باعث ہو جاتے ہیں بعض لوگ محض الفاظ پرستی کی دھن میں پھنس کر ان امور کے قائل ہو جاتے ہیں جو نہ صرف اخلاق ہی کے منافی ہوتے ہیں بلکہ خود انسانی فطرت کے بھی خلاف ہوتے ہیں لفظ تجرید بھی بعض کے واسطے بعض دفعہ چند در چند غلطیوں کا باعث ہو جاتا ہے جب تجرید سے مراد ناکدخدائی لی جاتی ہے تو یہ غلطی تمدنی رنگ میں بہت کچھ نقصان کا موجب ثابت ہوتی ہے بعض لوگوں کا یہ مقولہ ہے کہ مجرد رہنا زندگی کی خوش اسلوبی گزارنے کے واسطے ایک اچھا ذریعہ ہے ممکن ہے کہ اس میں کچھ سچائی بھی ہو لیکن تمدنی ضروریات کے واسطے یہ روش ایک ایسا غلط راستہ ہے کہ جس کی غلطی سے کبھی انکار کیا ہی نہیں جا سکتا تمدن کی سب سے بڑی کڑی مناکحت اور شادی ہی ہے یا یوں کہئے کہ تمدن اسی رشتہ سے شروع ہوتا ہے یا اس پر اس کا بہت کچھ مدار ہے جب انسان متمدن الطبع ہے تو وہ کس طرح تجرید پر فتویٰ دے سکتا ہے اور کس طرح تجریدی رنگ قبول کر سکتا ہے اگر ایک طرف وہ اپنی فطرت میں تمدنی مواد پاتا ہے اور دوسری طرف عمل میں پیچھے رہتا ہے تو گویا وہ خودکشی کرتا ہے فرض کرو کہ تجرید ایک اچھا مسلک ہے سب لوگ مجرد ہوں تو یہ دنیا کس رنگ میں ہو جائے۔

یہ کہنا کہ تجرید میں انسان خوش اور آزاد رہتا ہے ایک سخت غلطی ہے ہمیشہ انسان باوجود دعوئے آزادی کے جب تک کوئی پابندی اپنے آپ پر عاید نہیں کرتا تب تک وہ خوش رہ...... ہی نہیں سکتا کھانے پینے میں دیکھو کس قدر پابندیاں ہیں چلنے پھرنے میں کس قدر پابندیاں ہیں اگر یہ پابندیاں نہ ہوں تو زندگی انسان کی ایک تہلکہ میں پڑ جاوے عورت اور مرد کا رشتہ خود انسان نے نہیں بنایا قدرت نے بنایا ہے اور خواہ کوئی کتنا ہی توڑے ٹوٹ نہیں سکتا یہ دونوں کڑیاں انسانی زندگی کا شروع

اور خاتمہ ہیں اگر ایک کڑی ٹوٹ جائے یا الگ کرلی جائے
تو گویا ساری زنجیر بھی ٹوٹ گئی۔

بعض لوگ کہتے ہیں علایق دنیا سے قطع تعلق ایک تجرید ہے
اور اس تجرید سے انسان کی قوتیں تزکیہ پاتی ہیں یہ کسی قدر
درست ہے کہ علایق سے وابستگی بعض دفعہ بہت کچھ
تکلیف کا باعث ہوتی ہے لیکن کون کون سے علاقے
توڑینگے سب سے زیادہ علاقہ اور وابستگی تو اس دنیا میں
رہنے کی ہے اور پھر اکل و شرب کی یہ تو کسی حالت میں بھی
دور نہیں ہوسکتی اگر کوئی شخص بعض ضروریات کے باعث
قطع علائق کرتا ہے تو شاید اُس کی دلیل کوئی جان رکھتی ہو
اور ایسی مثالیں مستثنیات میں داخل کی جانی چاہئیں
لیکن ایک کلیہ کے طور پر تجرید کی مدح سرائی تمدن کی مذمت ہے
بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ:۔

اگر عورت و مرد کا میل جول تحت اغراض شہوانی کے ہے تو
یہ بات بلا تعلق عورت و مرد کے عارضی طور پر بھی حاصل
ہوسکتی ہے ملک فرانس میں اس قسم کی تھیوریاں نکالا کرتی ہیں
لیکن موجودہ جنگ نے ثابت کردیا ہے کہ جن لوگوں نے یہ
تھیوری قائم کی تھی وہ ملک و قوم کی سرسبزی کے سخت
دشمن تھے اگر بعض صوفیوں نے تجرید پر زور دیا ہے اور وہ
دو چار تو اُن کے دلائل ہی کچھ اور ہیں اُن کی
غرض صرف تزکیہ ہے اور اِن لوگوں کی غرض بے لگامی
اور خودداری ہے۔

یہ کہنا کہ کھلے تعلقات میں اچھائی اور فائدہ ہے ایک سخت
مغالطہ ہے انسان جب کسی معاملہ میں کھلا رہ کر فائدہ نہیں اٹھا سکتا
تو اس صیغہ میں کیونکر فائدہ اٹھا سکتا ہے ہرجائی ہونا بعض
حالات میں اگر اچھا ہے تو اس صیغہ میں تو سخت معیوب ہے
اور دل کی تسکین تو کسی صورت میں بھی میسر نہیں ہوسکتی
کیونکہ دونوں طرف آزادی ہونے کی وجہ سے وہ محبت
اور خلوص نہیں ہوتا جس کی ضرورت ہے دونوں
دوسری جگہ ہوتے ہیں اور موقع کے منتظر نکاح ایک معاہدہ ہے
دنیا میں کوئی کام سوائے معاہدہ کے نہیں ہوتا اُس طرح
یہ معاہدہ قائم رہنا ضروری ہے یہ کہنا کہ عدم پابندی
کی صورت میں بھی ایک معاہدہ بھی ہوتا ہے یہ درست
نہیں یہ معاہدہ ہوتا ہی نہیں بلکہ ایک قسم کی خوش باشی
ہوتی ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا لوگ سمجھتے ہیں کہ
شادی کی ضرورت جوانی میں ہی ہوتی ہے یا صرف اولاد
ہی نصب العین ہے شادی کی غرضیں اور بھی ہیں وہ
کیا کیا:۔

طمانیت قلب ۔ ضرورت تمدن ۔ رفاقت ۔
خانہ آبادی ۔ تنظیم ضروریات ۔

یہ وہ ضرورتیں ہیں جو ہر شخص کو اپنی زندگی میں پڑتی ہیں
اور جس سے کسی کو گریز نہیں اور نہ کوئی ان سے انکار
کرسکتا ہے سب سے زیادہ ضرورت عورت کی اولاد
ہونے کی صورت میں ہی ہے اور خانہ آبادی کے واسطے
بھی لیکن زیادہ تر ضرورت بڑھاپے میں ہی ہوتی ہے
جب بال بچے بھی پرورش پاکر ادھر اُدھر ہو جاتے ہیں
تو اعزہ جواب دے چکے ہیں احباب کی رفاقتیں چھوٹ
جاتی ہیں خیالات کا ایک اوسنگ یا نوسانہ پہلو پیدا ہو
ہونے لگتا ہے پرانی صحبتوں کی ضرورت ہوتی ہے بایں
حالات ایک بلا تکلف رفیق اور محرم راز کی ضرورت ہوتی ہے

یہ تکلیف پوچھو ان لوگوں سے جن کی بیویاں یا رفیق پیری کے
زمانہ میں جدا ہو گئے ہیں بلکہ بچوں کی نظر میں ہی پھر جاتی ہیں
کچھ دنوں کے بعد پھبتیاں کرنے لگتی ہیں اقدلڑکے پوتے
ایک عضو زائد سمجھ کر دن بدن تنفر ہوتے جاتے ہیں ادھر یہ
مصیبت کہ پیرانہ سالی کچھ کرنے نہیں دیتی جسارت
جواب دے چکتی ہے ادھر خدائی فوجدار جن سے دنیا خالی نہیں
یہ کہنے لگ جاتے ہیں اب تو حضرت کسی مسجد یا کسی مندر میں بیٹھا
چاہئے یہ کوئی وقت ہے کہ خود بدولت بال بچوں اور پھوول
میں سارا دن (کھوں کھوں) کرتے رہتے ہیں یعنی کھانستے رہتے
ہیں۔

دیکھو بڑھاپے میں بیوی کی کس قدر ضرورت ہے ایک مقتدر
آدمی نے کہا کہ اگر میں کبھی وصیت کروں گا تو یہ بھی اس میں
لکھوں گا کہ اگر کوئی ۸۰ سال میں بھی رنڈوا ہو جاوے تو بھی
بیوہ مناسب عمر سے شادی ضرور کر لے کسی ہمراز نے پوچھا
یہ کیوں قبر میں پاؤں اور شادی جواب دیتے ہیں کہ میری
مراد کسی کنواری اور نوجوان عورت سے شادی کی نہیں ہے
بلکہ اپنے سے کوئی پانچ دس سال کم عمر کے ساتھ تم دیکھتے نہیں ہو
کہ میری ساری عمر کمائی ہوئی گنتی ہزاروں روپیہ چوں چوں
کر کے کمائے اور اپنی جان پر مصیبتیں لیں اور بیوی کے مرنے پر
بیٹی یوں ملتی ہے جیسے نام غوب ہو کر تا طبع عمر خاندان کو
ہر شخص دیکھتا ہے کہ کب گلے سے اترتے ہیں۔ اس قسم کے
واقعات بیشک دنیا میں گزرتے ہیں اور اپنی ضرورتیں بعض کو
ایک مزید تکلیف میں ڈالتی ہیں اگرچہ ایسے لوگوں کی کہانیاں
عام طور پر قطعی حکم نہیں رکھتی ہیں مگر پھر بھی ان میں کچھ
اصلیت تو ہے۔

ایک دفعہ ایک ڈاکٹر یوروپین سے پوچھا کہ اب آپ جو پنشن
لیکر جاتے ہیں ولایت جاکر کیا کرتے ہیں فرمایا کہ ایک سال تو
سیر سیاحت میں گزاروں گا اور بعد ازاں شادی کروں گا۔
تعجب سے پوچھا کہ اس عمر میں۔
فرماتے ہیں میں شادی صرف رفاقت کی خاطر کرتا ہوں
ایسی رفاقت جس کی وسعت مجھ سے زیادہ تر وابستہ ہو
یا وابستہ رہنے کا خیال کیا جا سکے چونکہ ولایت میں تھوڑے
دن کے رفاقت بڑی مہنگی ملتی ہے اس واسطے یہی ارادہ ہے
میں نے کہا آپ کی عمر زیادہ ہے بیوی کس عمر کی ہو گی۔
فرمایا کہ کوئی ۲۸ - ۳۰ - ۳۵ سال کی ہو تو بہتر ہو گا۔
پھر میں نے پوچھا کہ موت آپ پر جلد تر ہاتھ صاف کرے گی
کہا کہ میں ڈاکٹر بہ نسبت تمہارے اس بارہ میں ایک اچھا جواب
دے سکتا ہوں مرنا جینا قدرت کے ہاتھ میں ہے کم عمر پہلے مر جاتے
ہیں اور بڑی عمر والے باقی رہتے ہیں بہ نسبت بوڑھوں کے
بیوگان کے جوانوں کی بیوگان عموماً زیادہ ہیں۔
پھر میں نے کہا کہ اس قسم کی رفاقت کی ضرورت کیا ہے۔
فرمایا کہ شاید تم کو نہ ہو مجھے تو ہے میں اپنا جواب وہ خود
ہوں فرمایا کہ دنیا میں کئی ایک قسم کی جنگیں ہوتی ہیں یہ بھی ایک
قسم کی جنگ ہے جب اور جنگوں کے کشتوں پر معمولی افسوس کے
سوائے اور کچھ نہیں کیا جاتا تو اس میں بھی وہی صورت ہے
میں نے پھر پوچھا فرض کریں کہ آپ گزر گئے اور آپ کی بیوی
زندہ رہی پھر اس کی حالت۔
کہا کہ جو نوجوان کی بیوگان کی ہوتی ہے۔
میں نے کہا کہ آپ کے دل و دماغ پر اس صورت میں کیا
گزرے گی۔

ہے

خوش آنکہ من از دانش فرہنگ ہوئم
آئینہ یادم گر ازیں زنگ نہ بائیم

یہ تجرید سب سے اعلیٰ حضرتِ عمر خیام رحمۃ اللہ علیہ سب سے زیادہ الشب تجرید ہے اور اس تجرید سے دنیا کے بہت سے کام بھی چل رہے ہیں وہ سب یہ کہ دنیا میں ادر کام بھی کرکے ان کا حصہ بھی ہو اگر خصوصیت سے ایک کام ملحوظ نظر رکھ لیا جاوے جس طرح ہر انسان سب جگہ پر پھر پھرا کر رات کو اپنے گھر میں آکر اپنے بستر پر آرام کرتا ہے اس وقت جو کچھ اسے لطف آتا ہے اور مصیبت میں بھی وہ جو کچھ طمانیت پاتا ہے وہ گویا ایک تجرید ہی کا صدقہ اور اثر ہوتا ہے ہر شخص کا جدا جدا گھر ہونا ایک تجرید ہی ہے اور یہی فراغ خاطر کا موجب بھی ہے۔

ما یہ تجرید کیا ہے سب علائق سے رسماً آشنا ہو کر صرف ایک ہی علاقہ سے وابستہ رہنا یا اس سے لذت یاب ہونا یا جو لوگ مذہبی رنگ میں خدا رسیدہ اور خدا پرست ہوتے ہیں وہ دنیا سے باہر نکل جاتے ہیں یا کھاتے او پیتے ہیں زندگی کی اکثر منزلیں وہ بھی طے کرتے ہیں اور اس دنیا میں رہتے بھی ہیں لیکن چونکہ ان کا اس الشغل صرف خدا یا خدا پرستی ہوتا ہے اس واسطے انہیں خدا پرست اور خدا رسیدہ کہا جاتا ہے ورنہ ہوتے وہ بھی اس دنیا میں ہیں۔

نیست دنیا از خدا غافل شدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

اس دنیا میں سوائے خدا پرستی کے اور بھی طریقے دوسرے لوگوں کے واسطے تجرید کے ہیں قرآن مجید میں آیا ہے
کل حزبٍ بما لدیهم فرحون

یہ بھی اسی تجرید ہی کی جانب اشارہ ہے یوں سمجھو کہ یہ حضرتِ عمر خیام کی اسی آیتِ کریمہ کی تصریح اور تفصیل ہے ہر شخص کو کوئی نہ کوئی تجریدی رنگ رکھنا چاہئے کیونکہ اس بغیر زندگی کے دن اچھے نہیں گزرتے اور ایسا تجریدی رنگ دنیا سے عُلگر حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ اس دنیا میں رہ کر آنکھ بند کرکے اور کانوں میں روئی دیکر یہ کہنا کہ دنیا اور مناظر دنیا سے بہت پیچھے ہٹ گیا ہوں ایک فضول اور مردہ ہے جو اس دنیا اور اس کشمکش میں رہ کر کوئی تجریدی رنگ رکھتا ہو اور سب سے بڑا تجریدی رنگ خدا پرستی اور خدا پر دہی ہے اور اسی میں فروغ خاطر کامل حاصل ہوتا ہے اور یہی حقیقی تجرید ہے۔

قطعہ

دیدار یار از لب بام مرا بس است
زاں مہ جبیں تسلی عام مرا بس است

سلطان احمد

رباعی عمر خیام

آنہا کہ بکام دل جہاں داشتہ اند
چوں کام جہاں بجائے بگزاشتہ اند
تو پنداری کہ جاوداں خواہی ماند
پیش از تو ہم ایشان ہمچو تو پنداشتہ اند

صانع قدرت نے یہ آلہ بھی عجیب بنایا ہے دل کش آوازیں مفید باتیں اسی کے ذریعہ سے دل نشین ہو جاتی اور روح کی غذا بنتی ہیں سبحان اللہ قوتِ سامعہ بھی کیسی نعمتِ عظمیٰ ہے خدا کی دی ہوئی نعمتیں سامعہ، باصرہ شامہ وغیرہ ایسی ہیں کہ ایسی ایک نعمت بھی ایک انسان دوسرے کو نہیں دیسکتا- آنکھ- کان- ناک- زبان- صانعِ قدرت کے وہ آلات ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی بیکار ہو جائے تو انسان کی قدرت نہیں کہ پھر اس کو کار آمد بنا سکے - اندھے کو چشم بینا- بہرے کو گوش شنوا- گونگے کو زبانِ گویا- کیا انسان دیسکتا ہے؟ ہرگز نہیں- پھر تعجب ہے کہ انسان ایسی اور اس سے بڑھکر بھی نعمتیں پاکر خدا کا شکر گزار نہ ہو- ذرا سی بھی تکلیف پہنچے تو وہ اپنے خالق اپنے رازق رؤف ورحیم غفور و کریم خدا کی شکایت اور وہ بھی کس سے اپنے جیسے لوگوں سے کرنے لگے اور یہ نہ سوچے کہ اس میں اس کا اپنا قصور ہے یا اس حکیم علی الاطلاق نے ناحق بھی اس کو تکلیف میں ڈالدیا ہے حال آنکہ خدائے عزوجل کسی کو تکلیف نہیں دیتا لایکلف اللہ نفساً الا وسعہا اور انسان کو یا بہت فرماتا ہے ولا تلقوا بایدیکم الی التہلکۃ افسوس ہے کہ انسان راحت میں تو خدا کے ذکر و شکر سے غافل رہے اور آفت و مصیبت میں اللہ

وہ بھی جو اپنی طرف سے یا اپنے ہم جنسوں کی طرف سے پڑے تو خدا کی شکایت کرے سچ ہے ان الانسان لربہ لکنود خدا نے انسان کو جتنے اعضا دئے ہیں اُن سے لذت حاصل کرنے کے لئے دنیا میں ہزاروں نعمتیں بھی پیدا کر دی ہیں اور اُن نعمتوں سے جائز لذت اٹھانے کا حکم بھی دیدیا ہے - اپنے جسم کی راحت اپنی روح کی لذت- اور وہی خدا کا حکم بھی اور شکرِ نعمت کرنے پر زیادہ عطا کرنے کا وعدہ بھی لئن شکرتم لازیدنکم اور اس پر بھی حضرتِ انسان کفران نعمت اور خدا کی شکایت کئے جاتے ہیں- کہنے- سننے- دیکھنے- اور کھانے پینے کی بے حساب اچھی چیزیں موجود- مگر مائل ہونگے تو بری چیزوں کی طرف جو تکلیف دینے والی عزت لینے والی ہوں یا عقل نہ رکھتے ہوں تو عقل والوں کی بات بھی نہیں سنیں گے انسان ہو کر اپنے تئیں حیوانِ مطلق کی طرح بنا دیں گے اور پھر سمجھیں گے کہ ہم بھی انسان ہیں واہ ری انسانیت بریں عقل و دانش بباید گریست -

کان اور اعضا کی طرح چہرہ کی زینت ہے خصوصاً صنفِ نازک کے کان تو ظاہری زیب و زینت سے کان زر ہوگئے ہیں آتیاں بالیاں- کرن پھول جھمکے- تنبے وغیرہ کان کی شان کو دوبالا کرنے والے زیور ہیں بچوں کی تادیب و تنبیہ کے لئے بھی کان سے کام لیا جاتا ہے یعنی گوشمالی یہ ایک طرح کی سزا ہے- صاف کہتا ہے

کسی طرح ممکن نہ تھا جہاز خوف سے تھرتھرا رہا تھا تین انسان قید سمندر میں کب کے پہنچ چکے تھے مغرور بادبان کا تمانا بانا حباب آتش عشق کی گرد اڑ رہا تھا جو زندگی اور موت کے دریا ان مستولوں پر گھرا تھا جو مستول سے جڑے ہوئے پانی پر ڈگمگا رہے تھے اس آخری ناخدا کے رخت سفر میں لباس کے چند ٹکڑے اور سر پر ایک سرخ ٹوپی تھی جسم جا بجا سے زخمی اور خونخوار ضرب کے پرخون نشانات دکھائے دے رہے تھے موت یقینی تھی مگر اطمینان کی مسکراہٹ چہرے پر کھیل رہی تھی۔

(۳) ہیم جہاز کو سب سے الگ کھڑا دیکھ رہا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں کسی غیر معلوم قوت کے اثر سے اس کی حالت میں اضطراری کیفیت نمایاں ہو چلی تھی کچھ لوگ پیچھے کھڑے تھے ہیم نے پلٹ کر ان کے کان میں کچھ کہا رسی کمر سے جلد جلد باندھی گئی اور بے چین ہو کر ساحل سے ٹکرا کر واپس ہونے والی ایک لہر کے ساتھ ہی سمندر میں کود پڑا۔ موجیں اس بیباک انسان کی دلیری سے اور بھی غضبناک ہو گئیں پہاڑ کی بلندی تک اٹھایا۔ سمندر کی تہ تک پہنچایا۔ مگر ہیم ایسی گیدڑ بھبکیوں کو کب دھیان میں لانے والا تھا۔ برسوں موجوں کی گود میں کھیل کر پرورش پائی تھی۔ لہروں کو چیرتا۔ پانی کو کاٹتا آگے بڑھتا گیا جہاز زیادہ فاصلہ پر نہ تھا لیکن ہوا کا زور پانی کی قوت سے دم پھولنے لگا دو ہی چار ہاتھ اور باقی ہوں گے کہ ہاتھ پیر شل ہو گئے۔ ہیم اس حالت میں بھی اپنے مقصد کو نہ بھولا مگر اب جسم میں سکت باقی نہ رہی تھی ایک آواز منہ سے نکلی نگاہیں دو چار ہوئیں اور مدت کے بچھڑے ہوئے دو سینوں نے اس بیکسی کے عالم میں ایک دوسرے کو پہچان کر محبت اور ہمدردی سے ہاتھ اٹھائے روحوں نے ابدالآباد تک ساتھ رہنے کی قسم کھائی۔ جہاز چکرایا۔ موجیں سمٹیں۔ سمندر نے منہ کھول کر مستول کی چوٹی تک نگل لی۔ اور دم کے دم میں حباب پھوٹ پھوٹ کر پانی کی سطح ہموار ہو گئی۔

رسی کھینچی گئی اور دو مردہ جسم آپس میں لپٹے ساحل پر نکالے گئے۔

محمد احسن صدیقی

جذبات اکبر

ذوق ہلاک کوچۂ قاتل کو کیا کروں
وہ مضطرب کہ پردۂ محمل کو کیا کروں

مہلک سہی یہ شوق مگر دل کو کیا کروں
مانا جناب خضر بھی مہربان ہیں

اظہار اضطراب کا شائق نہیں ہوں میں
پائے ضعیف و دوری منزل کو کیا کروں

پہلو میں لیکن اس دل بسمل کو کیا کروں
قطع نظر گلوں سے۔ نہیں مانع جنوں

مجنوں نگاہ شوق سے خواہاں کہ ہو ...
... شوق ... دل کو کیا کروں

رموزِ بیخودی | یعنی حیاتِ ملیہ اسلامیہ مصنفہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے بیرسٹر ایٹ لا، لاہور۔

ہم نے اس کے ایک ایک شعر کو بنظر غور و تعمق پڑھا۔ پوری کتاب رموز و اسرار کا گنجینہ ہے ہم اس پر کیا لکھیں اس کے مصنف کا نام خود اس کی خوبیوں کا ضامن ہے۔

اس مثنوی میں ملتِ اسلام کے حیات بخش اسرار کو بیان کرکے اُن تاریک راہوں میں مشعل جلائی ہے جہاں چشمۂ حیات اس وقت پنہاں ہو رہا ہے اس زمانہ میں اسی کی ضرورت ہے کہ کوئی اس آگ کو جو ہماری بے التفاتیوں کی وجہ سے راکھ میں دبی ہوئی ہے آہستہ سے پھونک دے تاکہ وہ پھر روشن ہو جائے اسلام کوئی جدید بات نہیں چاہتا بعضوں نے نادانی سے یا خود غرضی سے اس میں نئے گل کھلانے اور اس کو بدعت سمجھنے لگے کسی باغ کے اصلی درختوں کو خزاں سے مرجھایا ہوا دیکھکر ان کی تیماری کرنا اور ان کی موجودہ خوبیوں کو نمایاں کرنا چاہئے نہ یہ کہ ان درختوں کے عوض دوسرے پودے لگانے کی کوشش کرنا اور وہ بھی اس سرزمین کے جن سے ہم نا آشنا ناواقف بے بہرہ ہیں ہمارے مقاصد کے منافی ہی آئینہ کا زنگ دور کرنے میں جو فائدہ اور جو نمائش مدنظر ہے اُس پر نقش و نگار بنانے سے وہ بات کبھی حاصل نہیں ہو سکتی غرض ڈاکٹر صاحب موصوف نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ قابلِ ستائش اور لائق تقلید ہے ؎

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید | کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

اب ہم بعض مقام سے نمونے کے طور پر اس مثنوی کے کچھ شعر پیش کرتے ہیں جس سے ناظرین کو ڈاکٹر صاحب کی طلاقت لسانی اور زورِ طبیعت کا اندازہ ہو سکے گا اور معلوم ہو جائیگا کہ عارف رومی کی مثنوی کا مطالعہ اور میرزا بیدل کے صوفیانہ طرز انشا دکا تتبع ایک طبع وقاد کو کیسا روشن کر دیتا ہے چنانچہ مثنوی کی ابتداء میں اپنے متعلق تحریر فرماتے ہیں ناظرین اندازِ بیان کو ملاحظہ فرمائیں خصوصاً تیسرے شعر کا مصرع ثانی داد طلب ہے: ؎

از سخن آئینہ سازم کردہ اند | وز سکندر بے نیازم کردہ اند
بار احساں بر نتابد گردنم | در گلستاں غنچہ گردد دامنم
سخت کوشم مثلِ خنجر در جہاں | آبِ خود می گیرم از سنگِ گراں
پردہ رنگم شمیمے نیستم | صیدِ ہر موجِ نسیمے نیستم
در شرار آباد ہستی اخگرم | خلعتے بخشد مرا خاکسترم

شعرِ چہارم کی بندش بھی ملاحظہ طلب ہے۔

پھر اسی سلسلے کے ضمن میں لکھتے ہیں۔ ؎

اشکِ خود بر خویش می ریزم چو شمع | با شبِ یلدا درآویزم چو شمع
جلوہ را افزودم و خود کاستم | دیگراں را محفلے آراستم

ان دونوں شعروں کو مکرر پڑھئے اور لطف اٹھائیے

اس کے بعد افرادِ ملت کے اجتماع کی تعریف میں ایک شعر کہا ہے جو اس سے بڑھکر جامع ہو نہیں سکتا ؎

فرد و قوم آئینۂ یک دیگر اند
ہم خیال و ہم نشین و ہمسر اند

اختلاطِ افراد اور ضرورتِ نبی کے بیان میں لکھتے ہیں ؎

مرداں خوگر بیکدیگر شوند — سُفتہ در یک رشتہ چوں گوہر شوند
تا خدا صاحبدلے پیدا کند — کز فغانے نغمۂ انشا کند
بندہا از پاک شاید بند را — از خداونداں رہاید بندہ را
نکتۂ توحید باز آموزدش — رسم و آئین نیاز آموزدش

بیانِ توحید

در جہاں کیف و کم گردید عقل — پے بمنزل برد از توحید عقل
ورنہ این بیچارہ را منزل کجاست — کشتئ ادراک را ساحل کجاست
دیں از و حکمت از و آئیں از و — زور از و قوت از و تمکیں از و
چوں مقامِ عبدہٗ محکم شود — کاسۂ دریوزہ جامِ جم شود

مصرعِ آخر کو مکرر پڑھئے!

اسی توحید کے ضمن میں اتحاد و اتفاق کے متعلق لکھتے ہیں ؎

ملت از یک رنگئ دلہاستے — روشن از یک جلوہ ایں سیناستے
قوم را اندیشہا باید یکے — در ضمیرش مدعا باید یکے

یاس و خوف کی مذمت میں لکھتے ہیں ؎

مرگ را ساماں ز قطعِ آرزوست — زندگانی محکم از لاتقنطواست
تا امیدی ہمچو گور افشاردت — گرچہ الوندی ز پا می آردت
قوتِ ایماں حیات افزایدت — ورد لا خوف علیہم بایدت
بیم چوں بند است اندر پا ما — ورنہ صد سیل است در دریائے ما

نغمۂ میں یہ اشعار بھی قابلِ حفظ ہیں ؎

دینِ فطرت از نبی آموختیم — در رہِ حق مشعلے افروختیم
ایں گہر از بحرِ بے پایانِ اوست — ما کہ یک جانیم از احسانِ اوست
تا نہ ایں وحدت ز دستِ ما رود — ہستئ ما با ابد ہمدم شود
رونق از ما محفلِ ایام را — او رسل را ختم و ما اقوام را
خدمتِ ساقی گری با ما گزاشت — داد ما را آخریں جامے کہ داشت

قطع اخوت کی مذمت میں کہتے ہیں ؎

مردمی اندر جہاں افسانہ شد — آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند — آدمیت گم شد و اقوام ماند

ذیل کے اشعار آئین و قوانین کی تعریف میں کیا خوب کہے ہیں اور کیا اچھی تشبیہیں تلاش کی ہیں ؎

برگِ گل شد ز آئیں بستہ شد — گل ز آئیں بستہ شد گلدستہ شد
نغمہ از ضبطِ صدا پیداستے — چوں پریشاں شد صدا غوغاستے
در گلوئے ما نفس موجِ ہواست — چوں ہوا پابندِ نے گردد نواست

مصنف نے سب سے زیادہ کمال یہ دکھایا ہے کہ آخر میں تمام مثنوی کا خلاصہ سورۂ اخلاص کی تفسیر میں بیان کر دیا ہے۔ اس میں بھی بعض بعض شعر چستئ بندش اور جدتِ معانی کے لحاظ سے بے مثل کہے ہیں۔ چنانچہ ایک مقام پر کہتے ہیں ؎

گر باللہ الصمد دل بستۂ — از حدِ اسباب بیروں جستۂ
گرچہ باشی مور و ہم بے بال و پر — حاجتے پیشِ سلیمانے مبر
خود بخود گردد در میخانہ باز — بر تہی پیمانگانِ بے نیاز

آخری شعر اگر سو بار بھی پڑھا جائے تو سیری نہیں ہو سکتی پھر اسی کے ضمن میں کہتے ہیں ؎

بے نیازی نازہا دارد بسے — نازِ او اندازہا دارد بسے
تا کجا طوفِ چراغِ محفلے — ز آتشِ خود سوز اگر داری دلے

اس آخری شعر کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ استغنا کے متعلق ایک

زیادہ کوئی نہیں لکھ سکتا اس کی تقطیع بھی اُتنی ہی خوبصورت اور چھوٹی ہے جتنی کہ اس مثنوی کی بحر ہے۔ جا بجا زرافشانی کا ممد و معاون ہے کاغذ نہایت اعلیٰ درجہ کا چکنا ولایتی ہے۔ اس مثنوی میں محاسن کے سوا ہم کو کوئی بات نظر نہیں آئی۔ البتہ بعض قافیوں کے متعلق ہم کو پس و پیش ہے لیکن مصنف نے اُس قسم کے قافیہ کو بار بار لکھکر اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ انھوں نے اس میں اجتہاد کیا ہے اور وہ اس کو عمداً کہتے ہیں ماہرین فن سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ فن شعر میں جو عیب جان بوجھکر رکھا جائے اُس کا شمار عیب میں نہیں ہوتا وہ شبہ یہ ہے کہ مضارع کی دال کو حرف روی قرار دیا ہے جیسے کشند کا قافیہ نہد اور شود کا خورد جو ایطا سمجھا جاتا ہے اس لئے کہ دونو جگہ دال مضارع کی ہے جس سے تکرار قافیہ بیک معنی ہو گئی۔ البتہ نہد کا قافیہ اگر جہد اور شود کا قافیہ رود کیا جائے تو یہ نقص باقی نہیں رہتا اس قسم کے دو چار شعر ہم یہاں نقل کرتے ہیں ؎

چوں ز خلوت خویش را بیروں کشند — پائے در ہنگامۂ جلوت نہد
عشق صید از زور بازو افگند — عقل مکارست و دامے می نہد
تا قوی از حکمت اشیا شود — ناتواں باج از توانایاں خورد

ایک جگہ الف و نون فاعلی یا حالیہ کی تکرار ہو گئی ہے ؎

در سکوت نیم شب نالاں بدم — عالم اندر خواب و من گریاں بدم

بعض جگہ قافیوں میں اقواکو جائز رکھا ہے جو اختلاف توجیہ سے پیدا ہوتا ہے یعنی ماقبل روی کی حرکت میں اختلاف مثلاً ؎

زندہ فرد از ارتباط جان و تن — زندہ قوم از حفظ ناموس کہن
از قبائے لالہ ہائے ایں چمن — پاک شست آلودگیہائے کہن
ثابت و سیارۂ گردوں وطن — آں خداوندان اقوام کہن

ربط ایام آمدست ما را پیرہن — سوزنش حفظ روایات کہن

اشعار بالا میں حرف روی کے ماقبل ایک جگہ مضموم ہے اور ایک جگہ مفتوح ہے یعنی فارسی میں تو کہن بضم ہائے ہوز ہے بالفتح نہیں ہے جس طرح نظامی علیہ الرحمہ کہتے ہیں ؎

بپرسید کیں چیست مہمانِ کہن
چہ پیرایہ را شاید از اصل و بُن

اردو کہنے والے البتہ چمن و وطن کے ساتھ کہن کا قافیہ کرتے ہیں
مصنف سے لاہور کے پتہ پر مل سکتی ہے قیمت شاید ۱۲ رکھی گئی ہے ؎

مثنوی میگھ دوت یا پیام تاریخی غربت شیدا

ہندوستان کے نامور قدیم شاعر کالی داس کی نظم میگھ دوت کو جناب صمیم برنی نے اردو کا جامہ پہنایا ہے ہم بھی اس سے لطف اندوز ہوئے اصل کتاب کو تو ہم نے پڑھا نہیں اور نہ پڑھ سکتے ہیں اس لئے کہ اس زبان سے ہم نا واقف ہیں جس میں کالی داس اپنے انوکھے خیالات نظم کیا کرتے تھے لیکن اس ترجمہ کو دیکھکر ہندی شاعرانہ تخئیل کے ذوق سے ہم مست ہوئے بغیر نہ رہ سکے گویا ترجمہ نے اس شراب کو دو آتشہ بنا دیا ہے کیوں نہ ہو ہندی تخئیل اردو کی بندش ہونے پر سہاگا ہے اپنے ملک کی خصوصیات کچھ اور ہی تاثیر رکھتی ہیں۔ ان کے مزہ سے ہم واقف اُن کے کیف سے ہم باخبر۔
جن چیزوں کو ہم نے دیکھا ہی نہیں ان کی تشبیہوں کا دل پر کیا اثر ہو گا ایران کی بلبل ہزار داستاں کے نغموں کا ذکر سنکر ہم اس قدر خوش نہیں ہو سکتے جس قدر ایک کویل کی کوکو سے متاثر ہو سکتے ہیں سنبل و سوسن اور نسرین و نسترن کے بیان سے ہمارا دل و دماغ اتنا معطر نہیں ہو

جیسے کہ چمپا، چنبیلی، کیسر، مولسری کا ذکر سنکر ہو سکتا ہے۔

ہم بعض بعض مقام سے کچھ شعر ناظرین کی تفریح طبع کیلئے درج کرتے ہیں جن سے حسن تخیل اور خوبی بندش دونوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

جنگل اور ندی کا کیا دلفریب سماں لفظوں میں دکھایا ہے ؎

پھولوں سے وحشت ہوگا سارا چمن — اُن کی خوشبو سے مور ہونگے مگن
راہ اُن آکے وہ بتائیں گے — ناچ کر تجھکو وہ رجھائیں گے
بگلوں کی جب قطار اُڑیگی وہاں — کیا کہوں ہائے تجھ سے میں وہ سماں
ہیں وہاں ارجن اور مولسری — مست ہیں ہائے خوشبو سے اُنکی سبھی
موروں کی کچھ عجب ادائیں ہیں — دل کش اُن کی مگر صدائیں ہیں
مور پھولے نہیں سمائیں گے — ہو نکلے باہر وہ اپنے جامے سے
اپنی مادہ کو وہ رجھائیں گے — مست ہوکر اُدھر وہ جائیں گے
جب خمیدہ کریں گے اپنا تن — دم سے لگ جائیگی وہیں گردن
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے وہ جھونکے — گرم ارجن چنبیلی سے ہیں بسے

محبوبوں کی تعریف میں چند اشعار ہم مختلف مقامات سے نقل کرتے ہیں ؎

واں جواں عورتیں نہاتی ہیں — اُبٹنہ کیسر کا وہ لگاتی ہیں
کانوں کی لو میں کند کی کلیاں — کتنا پیارا دکھائیں گی وہ سماں
پھول ہلکے ہیں جو چنبیلی کے — ہیں لڑی بن کے چوٹیوں میں گندھے
پھولنے والے ہیں گرم کے جو پھول — چشم مشتاق کو ہیں مقبول
جب پپیہے کا وہ سنیں گے شور — اور کم ہوگا بس دلوں کا زور
پی کہاں پی کہاں کی رٹ سنکر — دونوں ہاتھوں سے تھام لینگے جگر
کانوں میں گل لگے ہیں چمپا کے ہار — جو نہ چاہے اُنہیں خدا کی مار
بالیاں کانوں کی موتیوں سے بھری — گویا اپنے مقام پر ہیں پری

کیتکی اور کمل کے پھولوں سے — تازے تازے وہ ہار ہیں گوندھے
پھولوں کی بالیاں ہیں کانوں میں — شور ہے ان کا داستانوں میں
بالوں کو وہ سمیٹ کر اک بار — جوڑے باندھیں گی وہ پری رخسار
نظر آئے کا بجلی کا جگنو — جھومنے میں وہ ہوگا زیب گلو
اُس پہ قوس قزح کی پھر ہیکل — دیکھنے والوں کو نہ آئے کل
چھیڑ سے ہوا کے آخر کار — سرکے گا آنچل اُن کا سو سو بار
اس سب سے عجب نہیں دیکھیں — گورا کا تنبی گلوں کی زنجیریں
لال کندرو کی طرح ہیں وہ لب — دُرِ دنداں ہیں یا کہ صنعت رب

ترجمے کے سوا جہاں جہاں مصنف نے اپنے ذاتی خیالات ظاہر کئے ہیں وہ بھی بلند ہیں۔ چنانچہ دیباچہ اور دو ساقی نامے اس کے شاہد عدل ہیں ؎

لیکن اس کے ساتھ مصنف کو اِن کی رنگین بیانوں نے ایسا محو کر رکھا کہ بعض امور میں قواعد و اصول فن شعر اور محاورۂ زبان کے خلاف عمل کرنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ ان میں سے بھی بعض شعر ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:۔ ؎

دل کش ہر ایک رنگ ہے اسکا — خوشنما گل ہے سنگ ہے اُس کا

اس شعر کے پہلے مصرع میں ہر ایک کی ی کا تقطیع سے ساقط ہے ؎

چھوٹی چھوٹی ادھر اُدھر ندیاں — کچھ نیا ہی دکھا رہی ہیں سماں
جب چلے زربدا ندی سے تو — ہو مبارک سفر یہ اے خوشخو
اس ندی کی بھی چال تو دیکھے — کھا کے بل مست چال چلتی ہے
چلتی ہے زور سے ہوا جو شتاب — ہٹتی ہے تب ندی سے چادر آب

ان تمام شعروں میں ندی بروزن بدی خلاف محاورہ ہے ؎

رنگ یہ دیتی ہے جنگل میں — اُجلا پن جو سیاہ مکس میں

اس کے مصرعِ ثانی میں پا پیوند کی وائل تقطیع سے ساقط ہو گیا یا یا ء کی ی ہے ۵

یہ دھواں محلوں کا جھرکوں سے — پیچ کھا کھا کے باہر اٹھتا ہے
جب چمکتے چمکتے برق تھکے — تجھکو آرام بھی تو لازم ہے
جبکہ یہ تنگ و تار راہ ہو طے — پھر تو چاہئے مجھے قرار ملے
چوٹیوں کو چھپائے برف میں ہے — کیوں کنول کا نہ پھول شرمائے
کیوں نہ ہم رنگ ہو کے تجھ سے ملے — تیری تہ میں بھی تو سفیدی ہے
میری الفت کی آگ اگر بھڑکے — اس کو لازم تجھے دبانا ہے

ان تمام اشعار میں ہے اور ے وغیرہ قافیہ غلط ہے اس لئے کہ ما قبل ایک جگہ مکسور ایک جگہ مفتوح بغیر حرف وصل صحیح نہیں ہے اسیطرح اس شعر میں ۵

سنگِ مرمر جڑا ہے صحنوں میں
مانند جن کی چمک سے ہیرے ہیں

ہیں اور ہیں قافیہ صحیح نہیں ہے ۵

سادہ دل لڑکیاں جو ہیں کنواری — باتیں ان کی تو ہوتی ہیں پیاری
عورتیں کنواری بھی کے خوش جب آئیں — للچا للچا کے کیا عجب رہ جائیں
پاک پانی ہے یوں ہے وہ شفاف — کنواری کمسن کا دل ہو جیسے صاف

ان اشعار میں کنواری بروزن فعلن موزوں ہوا ہے۔ جو بروزن فعولن چاہئے ۵

وہاں پر باگ کا سماں ہوگا — گنگا جمنا کا رنگ عیاں ہوگا

اس کے مصرعِ ثانی میں عیاں کی ی تقطیع سے ساقط ہے ۵

بھاگنے کی کریں گے وہ کوشش — اڑ رہی ہوگی اک انھیر کا ہش

اس شعر میں کوشش کا قافیہ کاہش غلط ہے ۵

ہے یہ پرجوش موسمِ برسات — خوش ہیں سب اپنی اپنی جگہ یکساں
اور بھی اک مرن کی ہے یہ بات — زندہ دل ہے یہ موسمِ برسات

یاد ہیں طرحِ چشم و چتون کے — ہے مشابہ وہ آنکھ ہرنی سے

اشعارِ بالا میں موسمِ برسات اور چشم و چتون غلط ترکیبیں ہیں ایک فارسی اور ایک ہندی لفظ کے درمیان عطف و اضافت صحیح نہیں ہے ۵

نخلِ کہنہ سے پٹخ کر گر پڑیں گے — گرجنے کا جواب وہ دیں گے

اس کے مصرعِ ثانی میں گرجنے کی (ر) ساکن ہو گئی ہے اگر (ر) کو متحرک پڑھیں تو وزن جاتا ہے ۵

سانسیں ٹھنڈی بھرے کیونکر وہ — جو کلیجہ مسوسے بیٹھے ہو

دم کے ساتھ ہو قافیہ نہ کرنا چاہئے ۵

آنکھیں ہیں لا کلام متعجب — چشمِ آہو یہ رنگ ہے غالب
جب ہو متوجہ تجھ سے وہ خوش رنگ — میری باتوں کو کہہ گزرنا تو

ان دونوں شعروں میں متعجب اور متوجہ کی (ت) ساکن نظم ہو گئی ہے جو غلط ہے اگر اس کو متحرک پڑھیں تو وزن جاتا ہے ۵

تیری تیلی بھی وہ بناتا ہے — آنسوؤں سے اسے نہلاتا ہے

نہلا تا جلا تا کے وزن پر نہیں سمجھا تا کے وزن پر چاہئے ؛

لکھائی چھپائی کاغذ سب اچھا ہے قیمت ایک روپیہ مناسب ہے علی گڈھ انسٹیٹیوٹ پریس سے درخواست کیجئے ؛

تذکرۃ الحبیب | مولفہ جناب منشی محمد انوار الحق صاحب ایم اے ڈائرکٹر تعلیمات بھوپال۔ اس کے متعلق صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ ذکر الحبیب جیسٹ اسلام کے بہتر فرقوں میں کوئی فرقہ ایسا نہ ہوگا جو اس کو محبت کی نظر سے نہ دیکھے۔ فائدہ کے لحاظ سے مسلمانوں کے لئے تعلیم و تعمیر کا اس سے بہتر کوئی رہنما نہیں ہو سکتا جیسا کہ خود اللہ نے تحمید فرمایا ہے :

"صرف زبانی نصیحت پر عمل کرنا زیادہ شاق ہوتا ہے
اگر وہی بات کسی واقعے کے پیرایہ میں بیان کیجائے
تو اس پر عمل کرنا زیادہ آسان ہو جاتا ہے"

جنابِ مفتی صاحب کا یہ قول بھی گوش ہوش کا آویزہ بنانے کے قابل ہے:-
"کیا یہ غیرت کی بات نہیں ہے کہ اسوۂ حسنہ نبوی کے
ہوتے ہوئے بھی ہم حسنِ معاشرت میں غیروں کے
نمونوں کو اپنا نصب العین بنائیں"-

یہ قول بالکل درست ہے جس کے اخلاق کی لوح طغرائے انک لعلیٰ خلق عظیم کے عنوان سے مزین ہو
اس کو چھوڑ کر دوسروں کے اخلاق کو نمونے میں پیش کرنا آفتاب کے آگے مشعل جلانا اور ماہتاب کے روبرو آئینہ دکھانا ہے۔

ہم تمام مسلمانوں کو اس متبرک کتاب کے پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ہر مسلمان کے گھر میں اس کی ایک جلد ضرور ہے
ان تمام مفاد اور خوبیوں کے مقابل میں اس کی قیمت صرف (عمہ) بہت کم ہے ع
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

ایڈیٹر

کلامِ شاد

ہز ایکسلنسی راجا راجایان کشن پرشاد مہاراجہ بہادر یمین السلطنت جی سی آئی ای
(شاد بالقابہم)

آنے وصال میں مجھ سے کشیدہ ہوتا تھا — مرے نصیب میں آتا خود رسیدہ ہوتا تھا
پسِ فنا بھی مری خاک ہے گلی تیری — فلک نزدہ کو یہیں آ رسیدہ ہوتا تھا
ہمیشہ عشق کے جوہر شناس کرتے قدر — گہر کی شکل مرا ہے آبدیدہ ہوتا تھا
ابھی جہاں میں محشر تھا یہ قیامت کا — ذرا تو اے قدِ جاناں کشیدہ ہوتا تھا
مثالِ سبزہ پامال کیوں ہے ہوتا — کہ مجھکو بعدِ فنا پھر دمیدہ ہوتا تھا
مثالِ تیر جو سرکش ہے [illegible] — ہمیں کمان کی صورت کشیدہ ہوتا تھا
حسد کی وجہ سے ہے گویا رہتا — ترے نصیب میں شاخِ بریدہ ہوتا تھا
مُرید میرِ مغاں کس لئے نہ ہوتا شاد — شرابِ عشق کا لذت چشیدہ ہوتا تھا

مقالاتِ چند

مختصر مرحلۂ طولِ اَمل کیا ہوگا
قطع یہ سلسلہ بے تیغ اجل کیا ہوگا
دور کر تیرگیٔ دل کہ ابھی تک ہے وقت
ہو گئی صبح تو روشن یہ کنول کیا ہوگا
حرکتِ چرخ کی بس تیرے ہی آہنگ سے ہے
ورنہ بے صوتِ حُدی رقصِ جمل کیا ہوگا
چاہئے گوشۂ دل وادیٔ ایمن نہ طور
جلوہ زار اس کا بھلا دشت و جبل کیا ہوگا
دے رہا خال ہے جو حسن در گوش کے پاس
پہلوئے زہرہ میں زخ خندہ زحل کیا ہوگا
بیٹھے ہیں گوشۂ عزلت میں ہم اب تو یکسو

ہاتھ منت کش ارباب دول کیا ہوگا

دیکھتا ہوں کبھی حسرت سے تو کہتا ہے وہ شوخ
مجھکو دیکھ کے جلتا ہے تو جل کیا ہوگا

جب میں کہتا ہوں چلو ترک محبت ہی سہی
اس پہ وہ ناز سے کہتا ہے کہ چل کیا ہوگا

نظم اک آئی ہے وفانی پھر اس سے ناراض
خالق لم یزل و عز و جل کیا ہوگا

آنکھ پھرنے میں جو رنجش کا نہ پہلو ہوتا
مجھ کو آہو سے زیادہ رم آہو ہوتا

حسرت و درد کو کچھ اور جگہ مل جاتی
کاش کے دل سے بھی خالی مرا پہلو ہوتا

جیسا رسوائیوں کا ہے مرے رونے پہ ہجوم
ایسا میلا بھی الٰہی نہ لب جو ہوتا

پر خطر تھی شب ہجراں کی سیاہی ایسی
نکل آتا بھی جو ڈر سہم کے جگنو ہوتا

میرے نالے جو شب تار کو سمٹا لاتے
صبحدم چہرۂ خورشید پہ گیسو ہوتا

ہم دکھا دیتے کہ یوں دب کے نکلتا ہے چاند
بام پر سر کو جو نیوڑائے ہوئے تو ہوتا

سرمہ بھی دیدۂ قتال میں لگانا تھا ضرور
ساتھ آہو کے غبار رم آہو ہوتا

کھنچ آئے جدھر ہم کو دل زار نے کھینچا
جیسے کسی مجبور کو مختار نے کھینچا

نقشہ نہ کھینچا خواب پریشاں کا کسی سے
کھینچا تو مرے دیدۂ بیدار نے کھینچا

چھپ چھپ کے بھی رویا تو گنہگار ہوا میں
محشر میں گریباں غم دلدار نے کھینچا

جب آہ کی آثار سحر کے نظر آئے
گردوں کی طنابوں کو دل زار نے کھینچا

سولی نظر آئے گی مسیحا کو فلک پر
نالہ جو کسی دن ترے بیمار نے کھینچا

کن کن ثمروں کو قد موزوں نے سنبھالا
کس بوجھ کو موئے کمر یار نے کھینچا

میلا دل پر داغ ہے افشاں کا ستارہ
کاکل سے رہائی ہوئی رخسار نے کھینچا

لی ابر بہاری نے پر زاغ کی رنگت
نقشہ دم طاؤس کا گلزار نے کھینچا

ایسی ہے ترے ہاتھ کے بوسوں کی تمنا
اس شوق میں خط لب سوفار نے کھینچا

کیا کیجئے اے نالہ کہ صیاد تھا حائل
ہم کو تو بہت نکہت گلزار نے کھینچا

حیدر یار جنگ طباطبائی

رباعی عرفی

ساقی قدحے کہ گرچہ جاں نذر کند | مستاں بہ نشاط کار خود ساز کنند
چنداں بہ جگر تیغ ستم خواہم زد | کز عیب صد خنجر ز خم سر باز کند

تھا ملکِ حبش کا ایک سلطاں — نامی تھا دلیر تھا وہ ذیشاں
تلوار کا بخت کا دھنی تھا — ملک و زر و قوم سے غنی تھا
یکتائے زماں دلاوری میں — دریا دل تھا بہادری میں
تھی فوج کے اُسکی یوں روانی — جیسے بہتا ہوا ہو پانی
طوفان کی طرح جدھر کو آیا — بستی کو صاف کر دکھایا
موجوں کی طرح جو فوج آئے — ندی اک خون کی بہائے
جن جن کے سرکشوں کو مارا — تلوار کے گھاٹ اُنہیں اُتارا
پل لاشوں سے آن میں بنایا — جو منہ سے کہا وہ کر دکھایا
ہے شکل حباب زندگانی — دنیا ہے بے ثبات و فانی
پیغامِ اجل جو اُس کو آیا — فرزند نے تاج و تخت پایا
بچپن میں یہ آرزو بر آئی — شاہی فضلِ خدا سے پائی
والد کا اُٹھا جو سر سے سایا — اللہ نے حکمراں بنایا
دن رات تھا عیش کا ترانا — طبلہ کی تھاپ ناچ گانا
کہنا نہ کسی کا اُس نے مانا — لٹنے لگا مفت کا خزانا
دربار سے کچھ غرض نہ کچھ کام — عشرت میں تھی صبح عیش میں شام
مرضی کے خلاف جس کو پایا — اُس کا سر تیغ سے اوڑایا
ضد کے باعث پھر از مانہ — بیگانہ ہوا ہر اک یگانہ
مخلوقِ خدا بھی سب پریشاں — حیران گریہ کناں و نالاں
کہتے تھے یہ سب یقیں تھا — جو کچھ کہا جس نے دل نشیں تھا
توفیق نیک اُسے خدا دے — تحقیق سے پہلے جو سزا دے

خلقت میں بے محل تھا غصہ — تھا آگ کا جزو کچھ زیادہ
صحبت بھی ہمسنوں کی دن رات — کرتا نہ تھا وہ وزیر سے بات
پروا کچھ نہ فوج کی نہ زر کی — تھی اُس کو خبر نہ اپنے گھر کی
دن رات تھا بس شراب سے کام — پریوں میں بنا ہوا تھا گلفام
عہدِ اول کا یہ بیاں ہے — آخر کی عجیب داستاں ہے
عاقل تھا وزیر جو پرانا — دیکھے ہوئے تھا وہ اک زمانا
خاموش تھا اپنی جا پہ وہ پیر — رہتا تھا رات دن وہ دلگیر
آیا سیاح اک قضارا — دیوان نے اپنے گھر اُتارا
آیا جب وہ وزیر کے گھر — دیکھا اُس کو بحالِ مضطر
رنج و افسوس میں جو پایا — قصہ دلچسپ اک سنایا
پھر زاغ و ہما کی حکمرانی — دلچسپ سنائی اک کہانی
بولا یہ وزیر پاس آؤ — کچھ تجربہ اپنا تو سناؤ
اُس نے کی عرض ہو جو فرصت — سُن لیجئے کچھ مری نصیحت
عاقل نے کہا کہو بصد شوق — مشتاق ہے دل مرا بصد ذوق
بولا سیاح مردِ عاقل — دشمن سے رہے کبھی نہ غافل
سچے دل سے جو مہرباں ہو — ہو جائے فدا جو قدرداں ہو
اس میں ہے ہر طرح کی ذلت — مغرور کو ہے عبث نصیحت
وہ دوست نہ جسمیں کچھ وفا ہو — الفت نہ ہو مگر ہو دغا ہو
وہ شخص کہ جس میں خودسری ہو — وہ امر نہ جس میں کچھ خوشی ہو
وہ قول جو فعل سے جدا ہو — وہ جھوٹ نہ جس کی انتہا ہو

بس میں تو صاف بہ سنت پاؤ / اُس کی صحبت سے ہاتھ اٹھاؤ
عاقل نے دیا خوشی سے انعام / ٹھہرایا اسے پئے عیش و آرام

ان سب سے کرو سدا کنارا / عاقل کو بس ہے یہ اشارا
تشریح طلب ہیں سب مقولات / قصہ ہے ایک ایک ہر بات

ہر امر میں ہو بخیر نیت / لازم ہے بشر میں آدمیت
جس کے دل میں خیال آئے / کرکے تشریح وہ بتائے

جس مال میں ہو نہ خیر و برکت / قاروں کی طرح وہ جائے غارت
فرصت نہیں اس لئے ہوں مجبور / خود ہی ہے اختصار منظور

بس ختم کیا کلام اُس نے / پیدا کیا سب میں نام اُس نے
کر حق سے دعا عدیل ناکام / اللہ کرے بخیر انجام

عدیل بلگرامی

رات کے پچھلے پہر طاؤس کی پکار

محبت لالہ و گل کی جو تھی دل میں وہ کام آئی
پر طاؤس پر آخر وہی نقش و نگار آیا

ہائے کیا آواز تھی کیسی تھی یہ پیاری صدا / تار کی صورت تری موجوں میں ہیں نغمے ہزار
جس نے مجھکو خواب سے چونکا دیا۔ تڑپا دیا / پھر میں سننا چاہتا ہوں وہ نوائے دلفریب
اُس کے نغمے صبحگاہی بھی جی بھر کر سُنے / پھر ذرا پہنچا دے مجھ تک وہ صدائے دلفریب
لے اُڑا فوراً نسیم صبح کا جھونکا اُسے / شرق کی جانب سے آئی پھر ہوا مستانہ وار
نیند کا ماتا نہ سمجھا میں کہ کیا آواز تھی / اور وہی ہمراہ اپنے لیکے صوت خوشگوار
نغمۂ جاں سوز مطرب یا صدائے ساز تھی / ہائے یہ آواز ہے طاؤس رقصاں کی پکار
کونسا طائر الٰہی یہ ترنم ریز تھا / جس کو سنتے ہی مرا دل ہو گیا پھر بیقرار
جس کا نغمہ ایسا حسرت خیز درد انگیز تھا / سن لیا ہے جب سے میرے لب پہ آہِ سرد ہے
اے نسیم روح پرور تو ہے غماز چمن / ہائے اس آواز میں کیا لطف ہے کیا درد ہے
تو ہی کہدیتی ہے ہم سے آکے سب راز چمن / میرے پیارے مور بتلا کس لئے نالاں ہے تو
ساز کے مانند ہیں تجھ میں صدائیں بے شمار / ہائے تجھ پر کیا بنی ہے کس لئے گریاں ہے تو

رقص کرتے کرتے کیوں ہو کر حزیں روتا ہے تو
پر تجھے یہ کیا ہوا ہے ہو گیا بیدار کیوں

آنسوؤں سے اپنا منہ کس واسطے دھوتا ہے تو
سب تو ہیں آسودہ راحت سے ہے تو بیزار کیوں

داغ ہیں کتنے دل میں بھی تیرے ذرا بتلا مجھے
ہاں میں سمجھا کس نے سوتے سے جگایا ہے تجھے

کیوں یہ کیسی آہ و زاری ہے ہوا کیا ہے تجھے
ہائے شاید دردِ الفت نے ستایا ہے تجھے

صبح ہونے میں ابھی کچھ دیر ہے اے بیقرار
آہ کر کے رو رہا ہے کیا اسی کی یاد میں

چاند بھی ڈوبا نہیں تارے ابھی ہیں آشکار
جس نے یہ تاثیر بھر دی ہے تری فریاد میں

نیند میں ہیں بلبلیں اور خوابِ نوشیں میں گلاب
ہے اگر ایسا تو سب عشاق میں اول ہے تو

سرو پر قمری ہے آموں پر ہے کوئل محوِ خواب
سب پرندوں میں ہے افضل عشق میں اکمل ہے تو

سو رہے ہیں سب کے سب غفلت میں ہے پیارا سماں
دیتی پھرتی ہے نسیمِ صبح سب کو لوریاں

میر سعادت حسین نجیب

قناعت

ہے قناعت کی بدولت مجھے دولت حاصل
قطرۂ آب بھی ہے میری نظر میں گوہر

زندگی راحت و آرام سے ہوتی ہے بسر
جب سے ہے قافِ قناعت پہ تسلط مجھکو

نہیں پھیلاتا ہوں میں ہاتھ کسی کے آگے
نہیں کرتا میں کبھی ملکِ سلیماں پہ نظر

پاؤں پھیلاتا ہوں اُتنا ہی ہو جتنی چادر
نہیں رکھتا ہوں ضرورت سے زیادہ زر و مال

مجھکو غنچے کے چٹکنے سے یہ آتی ہے صدا
راہزن کا ہے مجھے خوف نہ ہے چور کا ڈر

ہے وہ کافی مری مٹھی میں ہے تھوڑا سا جو زر
رات کو چین سے بستر پہ ہوں سویا کرتا

سرو کی طرح سے ہوں باغِ جہاں میں آزاد
دن کو آرام سے رہتا ہوں میں بے خوف و خطر

میں سبکبار ہوں کچھ بار نہیں ہے مجھ پر
میں نے چاہا نہ کسی کا بھی زوالِ نعمت

مل گیا علم قناعت ہے مرے دل پہ یہ راز
نہ کبھی رشک و حسد مجھکو ہوا در دل پر

خاک اکسیر ہے اور لعل و گہر ہیں پتھر
نہ کبھی اپنی بڑائی کا مجھے آیا خیال

[illegible] ہے حسیں
کی کسی پر بھی کبھی میں نے حقارت سے نظر

نہ کبھی مال کی قلت سے ہوا میں غمگین
نہ زیادہ کی تمنا میں ہوا میں مضطر
گر ملا مجھکو زیادہ تو کیا شکر خدا
کم جو پایا تو ہوئی صبر و قناعت میں بسر
امرا اوڑھ لیں اس کو تو پسینہ آجائے
میرا کمبل ہے دوشالے سے کہیں بڑھ چڑھکر

پاکے دنیا کا تو ہو ملک ہی مفلس ایسے جو ابھرا
مرد قانع ہے غنی گو کہ نہ ہو دولت و زر
لے گیا کچھ بھی نہ حسرت کے سوا اپنے ساتھ
ہاتھ خالی ہی زمانہ سے اٹھا اسکندر
چشم عبرت سے جہاں میں ہوس ہیں نظارے ہو
اس کے انجام پہ ہر دم مری رہتی ہے نظر

ایڈیٹر

جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

کہاں چھپتا ہے ہم آنکھوں میں ٹھہرنے کے لئے
پاؤں پھیلاتے ہیں اب دل میں اترنے کیلئے
آنکھیں ساقی کی سلامت مرے دشمن ترسیں
دُھرے پیمانے ہیں نیت مری بھرنے کیلئے
کس مسیحا کی ہے مقتل میں الٰہی آمد
موت بھی آج مری جاتی ہے مرنے کیلئے
اُس کی پلکیں ہیں غضب اس کی نگاہیں آفت
کتنے نشتر ہیں رگِ جاں میں اُترنے کیلئے
کھینچکر شکل مری دنگ ہے نقاشِ ازل
رنگ ملتا نہیں تصویر میں بھرنے کے لئے
پھوٹ کر روئے ہم اشکوں کی پریشانی پر
کیا خبر تھی کہ یہ موتی ہیں بکھرنے کے لئے
شوخیوں سے نگہِ ناز کہیں رکتی ہے
چلتے جادو سے کہے کون ٹھہرنے کے لئے
میرے مرنے کی خوشی کیوں ہے قیامت ہو گی
زندہ ہو جاؤں گا پھر آپ پہ مرنے کے لئے
کوئی بن ٹھن کے اٹھا ہے مرے گھر آنے کو
بگڑے بیٹھے ہیں نصیب آج سنورنے کے لئے
دل میں آنے کی جو سوجھی تو لگے اڑنے مجھ سے
وہ یہ بہانہ لیے مرے مطلب مری تلاش کے لئے
قیس و فرہاد کے بعد آپ غنیمت ہیں جلیل
جیتے ہی یار پہ سو جان سے مرنے کے لئے

مولوی لطیف احمد صاحب اختر مینائی

اُن کے خرام ناز کا چرچا ابھی سے ہے
پُر شور وسلسلہ جو بر پا ابھی سے ہے

چھوٹے سے قد پہ چال قیامت کی پائی ہے
عمرش دراز باد وہ فتنا ابھی سے ہے

ہاتھ اُس نے دل پہ چاہے رکھا نہیں ابھی
سینے میں ہاتھ بھر کا کلیجا ابھی سے ہے

تلوار لی نہیں مرے قاتل نے میان سے
میری حیات و موت میں جھگڑا ابھی سے ہے

کمبخت دن بھی ہجر کا اب تک ڈھلا نہیں
صبح شبِ وصال کا دھڑکا ابھی سے ہے

صیاد دام لیکے جب آئے گا آئے گا
میرے گلے میں عشق کا پھندا ابھی سے ہے

آنکھیں تمھاری قہر کریں گی شباب میں
چتون تو دیکھو دِل کا تقاضا ابھی سے ہے

پایا تھا نام لیلیٰ و مجنوں نے بعدِ مرگ
میرے تمھارے عشق کا چرچا ابھی سے ہے

گو ابتدائے عشق ہے لیکن زہے نصیب
اختر کسی کی آنکھ کا تارا ابھی سے ہے

مولوی سید نوازش علی صاحب لمعہ

دیکھے تو کوئی حوصلہ اربابِ وفا کا
خود اُس کو سکھا دیتے ہیں انداز جفا کا

کیا اُس بُت کافر کو سزا ملتی ہے دیکھیں
سنتے تو ہیں ہم نام بہت روزِ جزا کا

باقی نہ زلیخا نے رکھا آنکھ کا پردہ
پیوند ہو گیا حضرتِ یوسف کی قبا کا

راہ و روش دھر سے واقف میں نہیں ہوں
رہزن یہ بھی دھوکا ہے مجھے راہ نما کا

اللہ کرے خیر ہے ہر وقت اشارہ
غمزے کو کرشمے کا کرشمے کو ادا کا

خاتم کوئی پہنے تو سلیماں نہیں ہوتا
موسیٰ نہیں ہوتا ہے جو مالک ہو عصا کا

کیا پوچھنے آئے ہو مرا حال سدھارو
جیتا ہوں بہر حال مرا احسان خدا کا

الٹے وہ پھرے ہیں مرے دروازے تک آکر
انداز کہے دیتا ہے نقشِ کفِ پا کا

مانا کہ نہ تھا میں کرم و رحم کے قابل
اتنا تو سمجھنا تھا کہ بندہ ہے خدا کا

اے لمعہ گنا ہوں کو میں ڈھانکونگا اسی سے
دامن ہے مرے ہاتھ میں اب آلِ عبا کا

مرزا فدا علی صاحب خنجر لکھنوی

دِل جاتا ہے تو جائے دِل جانے کو کیا کہئے
وہ خوش ہیں تو سب کچھ ہے غم کھانے کو کیا کہئے

اظہارِ محبت پر یوں ہنس کے کہا اُس نے
دیوانہ ہے بکتا ہے دیوانہ کو کیا کہئے

کچھ یاد ہے وہ شوخی جب دِل پہ چھیناتھا
اب بیٹھ کے پہلو میں شرمانے کو کیا کہئے

ہم تشنہ لب آئے تھے تشنہ ہی چلے ساقی
اس جام کو کیا کہئے میخانے کو کیا کہئے

اس حسن کی گرمی سے اس سوز محبت سے
خود شمع جلی شب بھر پروانے کو کیا کہئے

کچھ حسن کے جھگڑے ہیں کچھ عشق کے قصے ہیں
عالم ہے جوانی کا دل آنے کو کیا کہئے

اب ذکر جفا کر کے دل ان کا دکھانا ہے
گزری ہوئی باتیں ہیں افسانے کو کیا کہئے

تو دل کے تعلق سے واقف ہی نہیں ناصح
اے مشفق من تیرے سمجھانے کو کیا کہئے

اک بوند نہیں دل میں خون آنکھوں سے کیا برسے
پیمانہ تو پیمانہ میخانے کو کیا کہئے

اب چھپ کے بتوں سے تم بیٹھو گے کہاں خنجر
کعبہ بھی ہے گھر ان کا بتخانے کو کیا کہئے

مرزا محمد بہادر صاحب یاور وکیل ہائیکورٹ

ضعف سے لب پہ نہ اک حرف تمنا پہنچا
ہائے کس وقت میں بالیں پہ مسیحا پہنچا

سارے عالم میں ترے حسن کا چرچا پہنچا
ذکر تیرا ہی سنا خلق میں جس جا پہنچا

ہو اگر صبر تو ہو جاتے ہیں پیدا اسباب
پیاس ساحل کی بجھا دینے کو دریا پہنچا

کیوں نہ میں دل میں جگہ تیر کو دیتا ناصح
کس کی چتون سے یہ چھوٹا تھا کہاں آ پہنچا

چاند جس طرح سے آئینہ میں ہو عکس فگن
دل میں اس طرح خیال رخ زیبا پہنچا

رات بھر بزم میں ہنگامہ تھا پروانوں کا
شمع جب گل ہوئی پھر ایک نہ شیدا پہنچا

ابھی آنکھوں ہی میں تھا خواب جوانی کا خیال
صبح پیری ہوئی پیغام قضا آ پہنچا

جب ملا حسن کو اورنگ شہی روز نخست
دل کو ہاتھوں پہ لئے نذر کو میں جا پہنچا

دادخواہوں کے اڑے ہوش اسے دیکھتے ہی
ہمہمہ ہو گیا محشر میں کہ وہ آ پہنچا

پہنچیاں تو نے پنہائی نہیں او مشاطہ
کہیں دکھ جائے نہ اس شوخ کا پیارا پہنچا

عشق مجنوں سے ہوا فاش جہاں میں ہر چند
دور تک تذکرۂ پردۂ لیلیٰ پہنچا

دیکھ کر ان کو ہوا محو میں ایسا یاور
میرے لب تک نہ کوئی حرف تمنا پہنچا

مرزا الطاف حسین صاحب الطف

ساقی و محتسب میں اگر ساز باز ہو
پھر آدمی رات کو در میکدہ نہ باز ہو

بندے ہیں ہم کرم کے نہیں جاہ سے غرض
محمود ہو جہاں میں کوئی یا ایاز ہو

رند سیاہ کار کا مسجد میں کام کیا
میخانہ میں جنازہ کی میرے نماز ہو

پھر کچھ نہیں ہے خوف جو ہو ناخدا خدا
طوفاں میں لاکھ زیست کا اپنے جہاز ہو

دولت لگے جو ہاتھ قناعت کے دھر میں — پست و بلندِ دھر کا مطلب یہی ہے لطف
منعم کو زر کی پھر نہ کبھی حرص و آز ہو — ہو سرنگوں کوئی تو کوئی سر فراز ہو

(۱) بدیہہ گوئی کا رسالہ نہایت دلچسپ ہے اور مولوی ضیاء الملباانی صاحب کا دیباچہ نہایت مفید ہے مجھے یقین ہے کہ لٹریری مذاق کے لوگوں میں مقبول ہوگا کاش اس قدر مختصر نہ ہوتا۔

(ڈاکٹر) محمد اقبال لاہور

(۲) میری مزید پہچان کے لئے آپ کے عنایت کردہ "لقمہ ماہی" (بدیہہ گوئی) کا دلی شکریہ لیکن جس طرح اونچے حلقوں میں کھانے کی میز پر برف (آئس کریم) دو چار چمچوں سے زیادہ لینے کا دستور نہیں یعنی جی چاہے بھی تو شائستگی کا اقتضاء یہ ہے کہ "دو ہرانے" کا خیال نہ آئے مجھے اقرار کرنا پڑتا ہے کہ آپ کی کتاب سے میری سیری نہیں ہوئی یعنی لطافت کے ساتھ مقدار موجود کافی نہیں۔

اردو لٹریچر میں آپ کی جدت پسند طبیعت کی طرف سے یہ ایک نیا عنوان ہے جس کی تحت میں بذلہ سنجی لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی وغیرہ کے شواہد کثرت سے ملیں گے جن سے قدرتی طور پر آپ کے دلچسپ موضوعِ تحریر کا رقبہ بڑھ جائیگا

کتاب کا بوٹا سا قد ہندوستانی مذاق ہے ہم خالص عربوں کی طرح بے میل تو رہے نہیں۔ ہندی ہونا کوئی وصف نہیں عجمی مذاق کشیدہ قامتی چاہتا ہے اس کے لئے آپ کو ذرا پھیلنا پڑے گا۔ اس کا موقع دوسرے اڈیشن میں باقی رہتا ہے۔

مہدی حسن (افادی الاقتصادی)

(۳) بدیہہ گوئی اردو میں بالکل نیا اور قابلِ قدر رسالہ ہے اس موضوع پر کوئی کتاب علیحدہ نہ تھی اور کوئی وجہ نہ تھی کہ شاعروں کی اس خداداد قابلیت کو خاص شان کیساتھ مستقل حیثیت سے پیش نہ کیا جائے یہ اضافہ نہایت دلچسپ اور مفید ہے۔ آپ نے جس خوبی اور سلیقہ کے ساتھ ترتیب دی ہے اُس کا اعتراف ہر ذوق سلیم پر واجب ہے۔

حامد حسن قادری (اڈیٹر سعید کانپور)

(۴) ادبیات کی ایک صنفِ مخصوص جسے فرنچ و انگریزی میں (Belles lettres) کہتے ہیں وہ ہوتی ہے جس کا مقصود تمامتر ادبی چاشنی ہوتی ہے۔ شعراء و اہل ادب کے لطائف و ظرائف

حکایات و مطایبات و دلچسپ حکایات سب اس عنوان کے تحت میں آتے ہیں

سید ناظر الحسن صاحب ہوش ایڈیٹر ذخیرہ نے بدیہہ گوئی کے نام سے اس فن سے متعلق ایک مختصر کتاب شائع کی ہے جس میں بدیہہ گو شعراء کا اردو فارسی عربی کلام مع ان کے مطالب کی توضیح اور ان کے "شانِ نزول" یعنی ان کے موقع و محل کے تصریح کے شائع کیا ہے ۔ ابتدا میں مولانا علی حیدر طباطبائی کا ایک محققانہ دیباچہ بھی شامل ہے ۔

کتاب کا موضوع بجائے خود نہایت دلچسپ ہے اس لئے کتاب بھی قدرتی طور پر دلچسپ ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ شروع سے آخر تک دلچسپیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ ہے فارسی و عربی کلام کی اردو میں شرح بھی کر دی گئی ہے جس سے محض اردو خوان بھی کتاب کے لطف سے مستفید ہو سکتے ہیں ۔

لیکن عام تذکروں کے مندرج واقعات کو نقل کر دینے سے یہ بہتر ہوگا کہ معاصر شعرا کے جو حالات اب تک دائرہ تحریر میں نہیں آئے ہیں انہیں قلم بند کیا جائے ۔ اس سلسلہ میں آغاز عنوان میر اکبر حسین صاحب سے کرنا چاہئے ۔ جن کے کلام کا بیشتر حصہ بدیہہ گوئی کی بہترین مثال ہے یہ کتاب ہمارے سرمایۂ ادب میں ایک پرلطف اضافہ ہے

عبدالماجد (بی اے)

---

(۵) میں نہایت ممنون ہوں کہ آپ نے اپنی دلچسپ اور سبق آموز کتاب "بدیہہ گوئی" کی ایک جلد بھیجکر مجھے اس کے مطالعہ کا موقع دیا۔ میں نے کتاب کو اول سے آخر تک نہایت شوق سے پڑھا فی الواقع آپ نے اس مبحث کے لطائف و ظرائف کو نہایت خوش اسلوبی سے یکجا کر دیا ہے اور کتاب بہیئت مجموعی اتنی دلچسپ ہے کہ ختم کئے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا ۔ افسوس یہ ہے کہ شعرائے اردو کے واقعات نسبتاً کم ہیں جی چاہتا ہے کہ اس سے زیادہ ہوتے بہرکیف جو لوگ فارسی اور عربی کے ذوق شناس ہیں وہ تو دل سے اس مختصر مجموعہ کی قدر کریں گے ۔ اردو دانوں کے لئے آپ نے ترجمہ کر دیا ہے بلا شبہ وہ بہت اچھا ہے مگر اصل میں جو لطف ہے وہ ترجمے میں ذرا پھیکا پڑ جاتا ہے ۔ بہرحال کتاب بہت دلچسپ اور قابل قدر ہے ۔

امید کہ ابنائے وطن آپ کی ہمت افزائی کریں ۔

مفتی محمد انوار الحق
(ایم اے ڈائرکٹر تعلیمات بھوپال)

---

(۶) عربی میں تاریخ سے کسی قدر فروتر اور عام قصص و حکایات سے بالاتر ایک فن ہے جو ادب و تاریخ کا جامع ہے اس کو محاضرات کہتے ہیں اردو میں اسکی صحیح مثال موجود نہیں ۔ گو ادنی درجہ کا اردو میں جو تاریخی سرمایہ بڑھایا جا رہا ہے وہ اسی قسم میں داخل کرنے کے لائق ہے لیکن ان کے مولفین کو چونکہ ان کو تاریخ کہنے کی تاکید ہے اس لئے ہم اس کو محاضرات کہنے پر اصرار نہیں کر سکتے ۔

ابھی حال میں جناب سید ناظر الحسن صاحب ہوش بلگرامی ایڈیٹر ذخیرہ حیدر آباد نے بدیہہ گوئی کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے

جو اس فن کی صحیح مثال ہے۔ مولف نے عربی فارسی اور اردو ماخذوں سے شعراء کی بدیہہ گوئی کے نہایت دلچسپ واقعات جمع کئے ہیں ساتھ ساتھ شعراء کے مختصر حالات بھی لکھے ہیں۔ بیان سہل زبان صاف اور واقعات شائستہ ہیں۔

سید سلیمان ندوی
مدیر رسالہ معارف اعظم گڑھ

(۷) بدیہہ گوئی پہنچ گئی۔ ماشاء اللہ خوب کتاب لکھی ہے مجھے ایسی جگر کاویاں تو دل سے پسند ہیں۔ ہزاروں صفحات کی ورق گردانی سے یہ درشاہوار حاصل ہوئے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی سعی مشکور فرمائے۔

حکیم مظفر حسین اظہر دہلوی

(۸) ایک کام سے ذرا باہر چلا گیا تھا اس وجہ سے بدیہہ گوئی کے لئے شکریہ عرض کرنے میں تاخیر ہوئی۔ معاف فرمائیے گا انوکھی چیز ہے۔ کاش اردو شعراء کی بدیہہ گویوں کی مثالیں اور زیادہ ہوتیں۔ کتاب دلچسپ ہے۔ مگر میری ناچیز رائے میں ضرورت سے زیادہ مختصر ہے اردو میں ممکن تھا کہ زبانی روایتوں سے کچھ اچھی مثالیں مل جاتیں۔ بہرحال کتاب قابل دید ہے اور اس کے لئے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

پریم چند

(۹) یہ کتاب جناب سید ناظر الحسن صاحب ہوش بلگرامی کے ذوق سلیم کا نتیجہ ہے اس میں موصوف نے فی البدیہہ اشعار کی نہایت عمدہ اور دلچسپ مثالیں پیش کی ہیں۔ عربی فارسی اور اردو شعرا کی بدیہہ گوئی کے متعلق نہایت دلچسپ واقعات جمع فرمائے ہیں کتاب اس قدر دلچسپ ہے کہ پڑھنا شروع کیجئے تو بغیر ختم کئے ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ قدماء کے واقعات کے ساتھ ساتھ اس زمانہ کے مشہور ادیبوں و انشاپردازوں۔ مہاراجہ سر یمین السلطنت بہادر شاد و عالیجناب فخر قوم آنریبل نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین صاحب بلگرامی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ کی بدیہہ گوئی کے متعلق واقعات پیش کئے ہیں نواب حیدر یار جنگ بہادر نظم طباطبائی لکھنوی نے ایک معنی خیز مقدمہ بھی اس کتاب کے ساتھ منسلک فرمایا ہے۔ جس میں بدیہہ گوئی کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مقدمہ میں یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ زبان اردو میں بدیہہ گوئی کی مثالیں اس لئے کم پائی جاتی ہیں کہ اردو والوں نے ہندوستان کے فطری و قدرتی اوزان کو ترک کر دیا اور عربی و فارسی شعرا کی تقلید کی موصوف کی رائے ہے کہ جب تک اوزان کو نہ بدلیں اردو میں بدیہہ گوئی نہیں ہو سکتی اگر یہ رائے صحیح تسلیم کی جائے تو اردو کے جن شعرا نے بدیہہ گوئی کے نمونے پیش کرکے اپنی جودت طبع و فکر رسا کا ثبوت دیا ہے وہ واقعی قابل قدر اور لائق ستائش ہیں اور اگر ہم انکی غیر معمولی ذہانت کا اعتراف نہ کریں تو سخت ناانصافی ہوگی یہ کتاب چھوٹی تقطیع کے دو سو صفحات پر جلی حروف میں نہایت خوشنما طبع ہوئی ہے قیمت صرف ایک روپیہ ہے جو اس گرانی کاغذ کے زمانہ میں زیادہ نہیں ہے ارباب مذاق سلیم کا فرض ہے کہ اس کتاب کو ضرور اپنے کتب خانہ کو زینت دیں۔

نذیر احمد (علیگ) (سابق مدیر اخبار ساقی آگرہ)

ہم اس امر ... رہے ہیں کہ بزرگ قوم

نواب **عماد الملک بہادر**

... صاحب بلگرامی - سی - ایس - آئی - کے

... دستیاب ہو گئے ہیں اُن کا مجموعہ ذخیرہ ... پریس

میں زیر طبع ہے جو عنقریب زیور اشاعت سے مزین ہو کر پبلک

کی دیرینہ آرزو پوری کرے گا

اس مجموعہ کے مطالعہ کرنے والوں پر ظاہر ہو جائے گا

کہ عبارت کی عام فہمی و بے تکلفی اور خیالات کی نفاست و

پاکیزگی کا خاص عنصر اس میں بدرجۂ اتم موجود ہے ایک سے ایک

مضمون بڑھا ہوا ہے جس کے مطالعہ سے ہر شخص کے معلومات میں

کیسا اضافہ ہوتا ہے اس کی پوری اُمید ہے۔

صفحات (۳۰۰) سے زائد ہوں گے اور نہایت عمدہ

کاغذ پر بہترین لکھائی چھپائی کے ساتھ طبع ہو کر ملک کے علم دوست

حضرات کی خدمت میں پیش کیا جائیگا قیمت (عہ) معہ

محصول ڈاک مقرر ہے جو بندگان قوم اس علمی مجلس میں حصہ

لینا چاہیں وہ اپنی خواہش کے مطابق ایک یا زیادہ نسخوں

کی فرمائش فرما کر اپنا نام درج رجسٹر کرا دیں - تاکہ بعد تکمیل طبع

رسائل عماد الملک بذریعہ وی - پی بھیجدیا جائے اور جو صاحب

چاہیں بذریعہ منی آرڈر قیمت بھیجکر طلب فرما سکتے ہیں -

ابہر الاشعار

مولفہ مولوی سید نوازش علی صاحب لمعہ

اس کتاب میں میر و مرزا سے لیکر غالب و ذوق کے معاصر

شعرائے دہلی کے اخلاقی اور حکمی دو ہزار سے زیادہ شعر

جمع کئے گئے ہیں اس کتاب کی تالیف سے اُن لوگوں

کی اصلاح مقصود ہے جو اردو کی شاعری کو محض خرافات کا

مجموعہ تصور کرتے ہیں اس کے سوا مصنفوں اور معلموں

اور مقرروں کو اپنی تقریر و تحریر میں برمحل اشعار چسپاں

اور اس کو دلچسپ بنانے کے لئے اس کتاب سے بہت

مواد مل سکتا ہے -

ہر صاحب ذوق کے پاس اس کی ایک جلد ہونا

ضرور ہے قیمت محصول کے علاوہ صرف (عمر) ہے

ذخیرہ پریس سے یہ کتاب ملسکتی ہے

بدیہہ گوئی

مؤلفہ

سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی ایڈیٹر رسالہ

زیور طبع سے آراستہ ہو گئی (۲۰۰) صفحہ کا حجم ہے چھوٹی

سائز ہے ولایتی کاغذ پر نہایت اہتمام کے ساتھ چھپی ہے

فارسی - اُردو - کہنے والے شعرا کے مختصر حالات اور وہ برجستہ اشعار

جو انھوں نے وقتاً فوقتاً بداہتہً کہے تھے اس میں درج ہیں

پڑھکر لطف اٹھائیے قیمت بھی کچھ نہیں صرف ایک روپیہ

محصول ضرور لگیگا

ملنے کا پتہ منیجر رسالہ ذخیرہ حیدر آباد دکن چادر گھاٹ

نمبر ۵ مئی ۱۹۱۸ء

اردو علم و ادب کی دلچسپیوں کا ماہوار رسالہ

ذخیرہ

ایڈیٹر سید مظہر الحسن ہوش بلگرامی

فہرست مضامین

قیمت سالانہ (للعہ)

مندرجۂ ذیل خطبۂ صدارت جو مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے ندوۃ العلما کے سولھویں سالانہ جلسہ منعقدہ ماہ اپریل [illegible] بمقام مدراس کے لئے لکھا تھا اگرچہ آپ عین وقت پر علیل ہو جانے کے باعث مدراس جانے سے معذور رہے تھے لیکن خطبۂ صدارت چھپوا کر اجلاس میں تقسیم کرنے کے لئے بھیجدیا تھا۔

یہ فاضلانہ خطبہ ہندوستان میں تعلیم دین اسلام و علوم عربیہ کی اشاعت کا حال ظاہر کرتا ہے اور علم دین کے موجودہ زوال پر نظر ڈال کر اصلاح و ترقی کی مؤثر تدابیر بتاتا ہے۔ اس خطبہ کی خوبیوں کا اعتراف نواب عماد الملک بہادر ایسے ماہر فن اور شفیق تعلیم نے اپنے خطبۂ صدارت حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس میں فرمایا ہے اور فی الواقع اس خطبہ کے مفید و علمی مضامین تجدید اشاعت کی ایک عرصہ سے سفارش کر رہے تھے۔ حسن اتفاق کہ ایک دفعہ نواب عماد الملک بہادر نے فرمایا کہ اس خطبہ کو ذخیرہ میں نقل کر دینا چاہئے تاکہ اس کے علمی مضامین سے ناظرین ذخیرہ بھی بہرہ اندوز ہوں۔ ہم نہایت مسرت کے ساتھ اس کو درج کرتے ہیں اور ناظرین سے بھی توقع کریں گے کہ وہ اس کی ایک ایک سطر کو بنظر تعمق ملاحظہ کریں اور دیکھیں کہ لکھنے کا ڈھنگ، طرز بیان کی خوش اسلوبی اور بیان کی سادگی حالی و آزاد کو داد دینے کے لئے تیار رہتی ہے۔

ایڈیٹر

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

حضرات علمائے کرام و معززین اُمت!
بغداد شریف کے مدرسہ نظامیہ کا سارے عالم میں شہرہ ہے
امام فخرالاسلام جب اول مرتبہ وہاں مسندِ درس پر بیٹھے تو انہیں
وہ اکابر یاد آئے جن سے مسند مذکور مزین رہ چکی تھی مثلاً شیخ ابو اسحٰق
شیرازی و امام غزالی۔ اس خیال سے امامِ ممدوح کے دل پر ایک چوٹ
سی لگی آنکھوں پر عمامہ رکھکر بے اختیار رو دیے اور فرمایا ؎

خلت الدیار فسدت غیر مسوّد
زمانہ اہل کمال سے خالی ہو گیا تو مجھ سا بے مایہ سرگروہ بنا
ومن العناء تفردی بالسؤدد
مجھ سے آدمی کا سالار یگانہ بننا کیسا اندوہ افزا ہے

آج کا حسرت انگیز بیان اس مثال سے کس قدر مطابق ہے جو کرسی جناب
استاذ العلماء مفتی محمد لطف اللہ صاحب مغفور اور مولانا احمد حسن صاحب
مرحوم سے بزرگوں کی صدارت سے شرف حاصل کر چکی ہو اُس پر
ایک ایسے شخص کا بیٹھنا جو نہ عالم ہے نہ کسی علمی خاندان کا فرد فی الحقیقۃ
حیرت خیز اور عبرت انگیز منظر ہے میں کبھی اس مقام پر قدم رکھنے کی
جرأت نہ کرتا اگر میرے تحیر کو ایک میرے مخدوم یہ لکھکر دور نہ فرما دیتے
"کبر ناموت الکبراء" اس مشہور مقولہ نے مجھکو یہ اطمینان دلا دیا کہ
یہ اگر کوئی شرف باعث انتخاب نہیں ہوا بلکہ بزرگانِ اُمت نے میری کم
مائگی کو نظر قبول سے ملاحظہ فرمایا ہے اب یہ بے سروسامانی میرے واسطے
سرمایۂ فخر ہے اور میں اپنی بے بضاعتی کے اعتراف و اقرار کیساتھ
تعمیلِ ارشاد اور خدمت کے واسطے حاضر ہوں ؎

بہ نازم بزمِ محبت کہ آنجا
گدائے بہ شاہے مقابل نشیند

باایں ہمہ سمجھتا ہوں کہ یہ شرف ایسا ہے جو نازش عمر اور کارنامہ زندگی
مانا جا سکتا ہے پس جن بزرگوں نے یہ اعزاز عطا فرمایا ہے اُن کے شکر و
سپاس سے میرا دل مالامال ہے جزاھم اللہ عنی خیر الجزاء یہ عرض
بھی ضروری ہے کہ بدوں آپ کے کرم اور توجہ کے میں اس خدمت کا
حق ادا نہ کر سکوں گا۔

بزرگانِ قوم! مجلس ہٰذا کے مقاصد و اغراض کے اعتبار سے
نیز اس لحاظ سے کہ زمانۂ حال میں عموماً مسلمان علوم عربیہ سے
بے پروا نظر آتے ہیں مناسب ہوگا کہ میں اس موقع پر علوم عربیہ کی مختصر
تاریخ عظمت اور وسعت بیان کروں تاکہ معلوم ہو کہ کیسی شاندار امانت
(جو اسلاف کی محنتوں کا نتیجہ اور حق و صداقت کا ذخیرہ ہے) ہمارے
ہاتھوں میں ہے اور ہم کو کیسے بے مثال سرمایہ کی حفاظت و ترقی کا حق
ادا کرنا ہے۔ کلام ربانی اور احادیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے
کہ دین الٰہی کے اہم مقاصد میں سے ایک مقصد علم کی ترویج و اشاعت
بھی تھا۔ کلام مجید میں بار بار مختلف پیرایوں میں علم اور علما کی فضیلت
بیان فرمائی ہے اور حصول علم کی تاکید۔ مثالاً چند آیتیں نقل کرتا ہوں

وَيَرْفَعُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	اور بلند کرے گا اللہ تم میں سے اُن لوگوں کے
مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ	جو ایمان لائے ہیں اور اُن کے جو علم
دَرَجٰتٍ	والے ہیں بہت سے درجے
وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ	جس کو حکمت دیدی گئی اُس کو بڑی
اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا اِنَّمَا	بھاری دولت بخش دی گئی اللہ سے
يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ	ڈرنے والے صرف علما ہیں۔
الْعُلَمٰٓؤُا	

خشیۃ الٰہی جو ذریعہ ہے نجات اور اجر کریم اور ہدایت پانے کا اُس کو
گروہ علما میں حصر فرمادینا علما کی انتہائی شان پر دلالت کرتا ہے۔
سب سے زیادہ علمی ترقی کی محرک وہ آیتیں ہیں جن میں آیاتِ ربانی

اور مظاہر قدرت پر غور و تدبر کی تاکید فرمائی گئی ہے اور یہ مظاہر قدرت اس قدر وسیع ہیں کہ طبعیات، زرعیات، برقیات، فلکیات، ارضیات وغیرہ تمام علوم اُن کے لانہایت دائرہ میں آجاتے ہیں۔

ارباب تفسیر نے لکھا ہے کہ حضرت آدم کو ملائکہ کا سجدہ کرنا تعظیم علم کے سبب سے تھا۔ نہ صرف حصول علم کی تاکید ہے بلکہ علم میں برابر ترقی کرنے کا حکم ہے چنانچہ حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دُعا تلقین فرمائی گئی:-

رب زدنی علما

یارب میرے علم کو بڑھا۔

حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کلام ربانی کی تائید بڑی اہتمام سے فرمائی ارشاد ہے:-

العلم حیات الاسلام وعماد الدین۔	علم اسلام کی جان اور دین کا ستون ہے۔
العلم سلطان اللہ فی الارض فمن وقع فیہ فقد ھلک	علم زمین پر خدا کی قوت ہے جو اُس سے مقابل ہوا تباہ ہوا۔
العلم خلیل المومن والعقل دلیلہ۔	علم مومن کا دوست اور عقل رہنما ہے۔
العلماء مصابیح الارض وخلفاء الانبیاء وورثتی وورثۃ الانبیاء۔	علما زمین کی روشنی ہیں اور انبیا کے نائب اور میرے اور انبیا کے جانشین۔
وزن حبر العلماء بدم الشہداء فرجح علیہ۔	علما کی روشنائی شہدا کے خون سے وزن کی گئی تو اُسکا پلہ بھاری رہا۔
ما تصدق الناس بصدقۃ افضل من علم	علم پھیلانے سے بہتر کوئی صدقہ نہیں۔

وہ علم باعث بربادی ہے جس پر عمل نہ ہو۔

مثل العالم الذی یعلم الناس الخیر وینسی نفسہ کمثل السراج یضیئ للناس ویحرق نفسہ۔	جو عالم اوروں کو نیکی سکھائے اور خود اپنے نفس کو بھول جائے وہ مثل چراغ کے ہے جو لوگوں کی روشنی کر اپنے آپ کو خاک سیاہ کر دیتا ہے۔
اشد الناس عذابا یوم القیامۃ عالم لم ینفعہ علمہ	جس عالم کو اس کا علم نفع نہ پہنچائے اُس کو قیامت میں سب سے زیادہ شدید عذاب ہوگا۔
علم لا ینفعہ ککنز لا ینفق بہ۔	علم غیر نافع ایسا خزانہ ہے جو صرف نہ کیا جائے۔

علاوہ قولی تاکید کے عملاً بھی علم و علما کی شان و فضیلت کا اظہار فرمایا ہے چنانچہ ایک مرتبہ مسجد میں حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو وہاں دو حلقے تھے ایک میں کچھ آدمی خدائے تعالیٰ سے دعا مانگ رہے تھے دوسرے میں درس و تدریس جاری تھی آپ نے ارشاد فرمایا:-

انما بعثت معلما

میں تو تعلیم دینے آیا ہوں۔

یہ فرما کر درس و تدریس کے حلقہ میں تشریف فرما ہو گئے۔ اس پاک تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ صحابۂ کرام میں علم کا ذوق سرایت کر گیا اور وہ قدسی گروہ علوم کی ترویج پر کمربستہ ہو گیا۔

سب سے اول کلام الٰہی اور حدیث و فقہ کی حفاظت و اشاعت پر توجہ فرمائی اُس سعی کا یہ نتیجہ ہے کہ صدہا برس گزر جانے پر بھی علم کے یہ دونوں سرچشمے تحریف و تصحیف کے گرد و غبار سے پاک اور صاف اپنے فیض سے عالم کو سیراب کر رہے ہیں۔ علاوہ دینی علوم کے دوسرے علوم کی خدمت کی بنیاد مسلمانوں میں خود صحابۂ کرام کے زمانہ میں پڑ چکی تھی۔ باب مدینۃ العلم حضرت علی مرتضیٰ

کی ہدایت و مشورہ سے ابوالاسود دُؤلی نے علم نحو کے اصول قائم کئے۔ علمی مذاق صحیح جو مشکوٰۃ نبوت سے سینوں پر چمکا تھا اُس کا اثر تھا کہ صحیح علم کا ذوق صحابۂ کرام میں تھا چنانچہ حضرت عمرؓ سے علم نجوم کی بابتہ پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا اُس کا وہ حصہ سیکھنا چاہیے جو رہنمائی میں کام آئے یعنی عملی پہلو لے لو وہی اور بے اصل حصہ چھوڑ دو حضرت ابن عباسؓ کا حلقہ درس بہت وسیع تھا۔ اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ اُن کی علمی تقریر کی قوت کا یہ عالم تھا جیسے سیلاب بلندی سے گرے۔ ہفتہ میں ایک دن اُن کے درس میں صرف ادب عربی کی تعلیم کے واسطے مخصوص تھا اور اُس کا لقب انھوں نے جُلّنی رکھا تھا حضرتِ معاویہؓ کے زمانہ میں بعض غیر زبانوں کے علوم کا اضافہ عربی میں ہوا۔

اسلام جس سرعت و قوت سے پھیلا اسی سرعت و قوت سے علم کا شوق مسلمانوں کے دلوں میں ترقی کرتا گیا پہلی ہی صدی ہجری میں ممالک اسلامیہ دارالعلوم بن گئے اس میں کسی قوم یا رنگ کی خصوصیت نہ تھی۔ تابعین کے طبقے میں بجز عرب کی جگہ عجمیوں نے لی عکرمہ، امام مکحول، امام ابوحنیفہ وغیرہ ائمہ جلیل القدر عجمی تھے حدیث میں ارشاد ہے الحکمۃ ضالۃ المؤمن من حیث وجدھا اخذھا (علم مسلمان کا گم شدہ سرمایہ ہے جہاں پا جائے لیتا ہے) اس گم شدہ سرمایہ کی تلاش میں مسلمانوں نے دنیا کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا جہاں سے خزانہ علم حاصل نہ کیا ہو کوئی علمی زبان نہیں چھوڑی جس کا سرمایہ عربی میں منتقل نہ کیا ہو علامہ ابن ندیم نے کتاب الفہرست تقریبًا چوتھی صدی کے وسط میں لکھی ہے اُس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یونانی، رومی، فارسی، سریانی، کلدانی، سنسکرت وغیرہ تمام قدیم زبانوں کے علوم ترجمہ ہو کر عربی میں آئے علامہ ممدوح ہر زبان کے مترجمین کا اُن کے ترجمہ کی ہوئی کتابوں کا مفصل ذکر کرتا ہے سنسکرت کے مترجمین میں منکہ، کنکہ، جودر، صنجہل، تہق، ابن دھن ہیں ان ناموں کی ترکیب صاف کہہ رہی ہے کہ عربی رقع میں ہندی صور مستور ہیں۔ ابن دھن کی نسبت لکھا ہے کہ برامکہ کے شفاخانہ کا مہتمم تھا اور ہندی سے عربی میں ترجمہ کیا کرتا تھا ابن ندیم کہتا ہے جن علماء ہند کی کتابیں نجوم اور طب کے متعلق ہم تک پہنچی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔ باکہر، راجہ، حنکر، واہر، آنکو، زنکل، اریکل، جبہر، اندی، جباری، جو کتابیں طب کی سنسکرت سے عربی میں ترجمہ ہوئیں اُن کی مفصل فہرست دی ہے صفحہ (۳۴۵) پر لکھتا ہے کہ ہارون الرشید کے وزیر یحییٰ بن خالد نے ہندوستان ایک آدمی کو بھیجا تاکہ وہ دوائیں لائے جو ہندوستان میں پیدا ہوتی ہیں اور اس ملک کے مذاہب کی تحقیقات کرکے لکھے۔ اس کے بعد یحییٰ مذکور نے ایلچی بھیجکر ہندوستان سے علمائے طب و حکمت کو بغداد طلب کیا اتنا لکھکر ابن ندیم نے خود بھی ہندوؤں کے مذہب کا ذکر مفصل کیا ہے اور اُن کے معابد اور مذہبی فرقوں کی تفصیل لکھی ہے ہندوستان کے علوم کی جو تحقیقات مسلمانوں نے کی اُس کی بہترین یادگار کتاب الہند ابوریحان بیرونی کی ہے جس میں تمام علوم ہندوستان سے مفصل بحث کی ہے کتاب مذکور کے دیباچہ نیز تاریخ مروج الذہب مسعودی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی پانچویں صدی ہجری میں علمائے اسلام کا ایک بڑا طبقہ تھا جس نے علوم ہندوستان کی تحقیق اپنا وظیفہ قرار دے رکھا تھا کیسی حیرت ہے کہ جس وقت سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا اسیوقت ابوریحان علمی فتوحات کے واسطے ہندوستان آیا اور اس ہنگامۂ جنگ و جدال میں برسوں ہندوستان میں رہ کر علوم سنسکرت حاصل کئے اور بالآخر ایسا زبردست فاضل ہو گیا کہ خود ہندوستان سے مشکل مسائل

اس کے پاس حل کرنے کے واسطے بھیجے جاتے تھے جن ممالک میں مسلمان گئے علم او عمل کا شوق ساتھ لے گئے حجاز، شام، یمن عراق ماوراء النہر، ایران، خراسان، کابل، ترکی، مصر، تونس مراکو (ا)سپین، چین، صقالیہ (سسلی) اور بحر روم کے دوسرے جزائر جاوا وغیرہ جزائر بحر ہند۔ غرض وہ کونسا ملک تھا جہاں مسلمان گئے اور وہ دارالعلوم نہیں بن گیا ان ممالک کے شہر اور قصبے دور کنار گاؤں تک مرکز علوم بن گئے تھے، مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ بغداد، اصفہان، نیشاپور، ہرات، طوس، دہلی، لکھنؤ، قیروان، قرطبہ، قاہرہ، قونیہ، بیت المقدس، بخارا سطح ارض پر کہاں کہاں بکھرے ہوئے ہیں لیکن ان میں سے جس مقام پر جاکر گوش عبرت سے سنئے گا ذرہ ذرہ کی زبان پر علوم اسلامیہ کا تذکرہ پائے گا۔ الاصابہ کے مقدمے میں ڈاکٹر اسپرنگر نے لکھا ہے کہ علم اسماء الرجال کی کتابوں میں کم سے کم دس لاکھ علما کا ذکر ہے معجم البلدان یاقوت حموی کی ضخیم جلدیں مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ وہ کونسا قریہ تھا جہاں مسلمان گئے اور وہاں نامور علما پیدا نہ ہوئے اسلام کی خصوصیت یہ تھی کہ علم ظاہر اور معرفت باطن دونو دوش بدوش تھے سرزمین اندلس کو ابن عربی اور ابن رشد دونوں پر ناز ہے۔ ملک ایران ابن سینا اور حضرت بایزید بسطامی پر فخر کر رہا ہے۔ بغداد کو جہاں کندی اور بنی موسی پر فخر ہے وہاں حضرت جنید و شبلی کی ذات مبارک سے بھی شرف حاصل ہے علیٰ ہذا القیاس یادش بخیر ہمارا ہندوستان بھی ترقی علوم میں کسی سے پیچھے نہیں رہا ہندوستان میں علوم عربیہ دوسری صدی ہجری میں اسلامی فتوحات کے ساتھ ساتھ ماوراء النہر وخراسان سے داخل ہوئے قدرۃً سب سے اول ملک سندھ اس نور سے روشن ہوا اور ہندوستان میں پہلا مدینۃ العلم ملتان تھا علماء کا ایک گروہ عظیم وہاں سے پیدا ہوا ملتان کے بعد لاہور دور غزنویہ میں مرکز علم تھا۔ لاہور کے بعد دہلی مرحوم گہوارۂ علوم بنی کیا کسی قلم میں یہ طاقت ہے کہ وہاں کے گوناگوں علوم اور گروہا گروہ علما کی شمار کر سکے؟

آہ دہلی مٹ گئی لیکن اب بھی اس کا نام فضل و کمال کی چمکتی ہوئی بجلیاں اپنے اندر مخفی رکھتا ہے سلطنت دہلی میں عہد تغلق کے بعد جب ضعف ہوا تو علم کی مسند جون پور میں جا کر بچھی جون پور کا نور لکھنو پر چمکا اور فرنگی محل اس وقت بھی دار العلم تھا جب دار السلطنہ لکھنو کا وجود بھی نہ تھا لکھنؤ میں آفتاب علم کس آب و تاب سے چمکا جس نے وہاں کے ہر قصبہ کو انوار علم سے منور کر دیا علمی دنیا میں بلگرام، سندیلہ، گوپامئو، خیرآباد وغیرہ سے کون واقف نہیں؟

شاہ جہاں فخریہ لہجہ میں کہا کرتا تھا "پورب شیراز ماست" میر غلام علی آزاد نے مآثر الکرام میں لکھا ہے کہ دیار پورب سے اودھ اور ضلع الہ آباد کا کچھ حصہ مراد ہے صوبہ بہار کو دہلی و لکھنؤ سے فیض پہنچا رہا بنگالہ بھی شیراز سے دور نہ تھا حافظ شیرازی کو خطۂ بنگالہ نے بھی دعوت دی تھی جو اگرچہ ناتمام رہی تاہم لسان الغیب کی زبان پر بنگالہ کا ذکر تھا ؂

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند
زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

ایک دوسرا مرکز علم گجرات تھا وہاں علم براہ راست دار الحکمۃ یمن اور شیراز سے سمندر کے راستہ سے پہنچا اور علامہ الہداد اور خطیب گازرونی سے کمالائے وقت وہاں سے اٹھے گجرات سے علم کی شعاعیں دکن اور مالوہ تک پہنچیں ابھی اس سرزمین کا بیان باقی ہے جہاں آج ہم سب جمع ہیں مدراس تعلیم جدیدہ کے اثر سے دماغوں میں ایک ایسی نوعیت رکھتا ہے کہ بظاہر اس کا

علومِ عربیہ کا کبھی مرکز رہنا بعید از قیاس سا معلوم ہوگا لیکن نہیں یہ علومِ عربیہ کے فیض سے پوری طرح بہرہ یاب رہ چکا ہے ابنِ بطوطہ جب آج سے قریباً چھ سو برس پہلے اس خطہ میں آیا تو سواحلِ ملابار کو علمِ عربی اور علماء سے معمور پایا وہ اپنے سفرنامہ میں قالقوط (کالیکٹ) ہنور، منجرور (منگلور) جرفتن وغیرہ اُس زمانے کے تمام مشہور مقامات کا ذکر کرتا ہے ساتھ ساتھ ہر جگہ کے علماء عربی کا اور مدرسوں کا تذکرہ کرتا ہے قالقوط کی نسبت کہتا ہے یہاں امیر التجار ابراہیم شاہ بندر ہے جو ایک بحرین کا فاضل ہے قاضی یہاں فخر الدین عثمان ہیں اور صاحبِ خانقاہ شیخ شہاب الدین گازرونی، منجرور (منگلور) کی نسبت لکھتا ہے یہاں کے قاضی ایک فاضلِ کریم شافعی ہیں جن کا نام بدر الدین ہے اُن کے یہاں مجلس درس گرم رہتی ہے بندر ہیلی کی نسبت لکھا ہے یہاں کی مسجد ہندو مسلمان دونو کے نزدیک محترم و واجب التعظیم ہے تجار کثرت سے اس میں روپیہ بھیجتے ہیں جس کی وجہ سے مسجد کا خزانہ معمور ہے طلبہ کی ایک جماعت اُس میں ہے جن کو وظائف ملتے ہیں۔

لطف یہ ہے کہ یہ تمام مقامات خاص ہندو راجاؤں کے قبضے میں تھے مسلمانوں کے مفتوحہ نہ تھے۔ آخر زمانہ میں شہر مدراس دار العلم بنا بارھویں صدی ہجری میں قاضی ابو بکر شافعی قاضی مدراس تھے اس سلسلے میں سب سے بڑا شرف اس شہر کو مولانا بحر العلوم کے قدوم سے حاصل ہوا جس طرح مدراس کا بندر سمندر کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے اسی طرح شہر مدراس کو یہ شرف حاصل ہے کہ علوم کے سمندر مولانا بحر العلوم اُس کے آغوش میں آرام فرما ہیں مولانا بحر العلوم نے ان ممالک میں فیضِ علمی کے دریا بہا دئے ملا علاء الدین، ملا جمال الدین، مولانا عبد الواجد اور بہت سے بزرگ اُس فیض کے یادگار تھے آخری یادگاروں میں حضرت شاہ عبد اللطیف صاحب ویلوری تھے جن کی ذات سے ویلور کی مشہور خانقاہ مشرف تھی ہندوستان میں کثرتِ علماء کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہمارے محترم ناظم نے جو تاریخ ہندوستان کے علماء کی لکھی ہے وہ دس جلدوں میں ہے اور پانچ ہزار سے زیادہ مشہور علماء کا اس میں ذکر ہے۔ اس قدر بیان سے آپ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ علومِ عربیہ نے عالم کو کس قوت و وسعت کے ساتھ اپنے انوار سے روشن کیا۔ علومِ عربیہ کی تاثیر کی وسعت اس سے ثابت ہوتی ہے کہ جس قوم اور ملک میں پہنچے وہیں علم و کمال کی بنیاد ڈال دی۔ امام عکرمہ حبشی۔ امام ابو حنیفہ فارسی۔ اور حکیم ابو نصر فارابی ترک تھے علومِ عربیہ کا اثر صرف مسلمانوں تک محدود نہیں رہا دوسرے مذاہب کے پیرو بھی ان سے فیضیاب ہوتے رہے۔ خلافت اندلس اور حروب صلیبیہ کے سلسلے میں جب یورپ کی اقوام کو مسلمانوں سے ملنے کا موقع ملا تو علمی شوق نے اُن میں بھی ایک تحریک پیدا کر دی ابو سینا اور ابن رشد کا فلسفہ صدیوں تک یورپ کے درس میں شامل رہا۔ اندلس مدت تک اہلِ یورپ کی تعلیم کا مرکز رہا انگریزی ہیئت کی کتابیں دیکھئے اصطلاحی الفاظ اُن کی عربیت پر صاف شہادت دیتے ہیں ہمارے ملکی بھائی ہندوؤں نے ہمیشہ علومِ عربیہ سے استفادہ کیا راجہ کندن لال اشکی کی منتخب تنقیح الاخبار کتاب راجہ رتن سنگھ زخمی کی حدائق النجوم اور رائے منوں لال فلسفی کی کتاب سدید الاستخراج فن تقویم میں اُن کے علم کی بہترین شاہد ہیں بنگال کے جدید دورِ ترقی کا سنگ بنیاد راجہ رام موہن رائے کے قابل ہاتھوں سے رکھا گیا ہے یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے پٹنہ میں عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی گذشتہ موسمِ سرما میں کلکتہ کے ایک نامو

بنگالی بابو صاحب نے مجھ سے کہا کہ ان کے باپ اور چچا کے زمانے تک کلکتہ سے بہ کثرت بنگالی عربی پڑھنے پٹنہ جایا کرتے تھے چنانچہ ان کے چچا نے پندرہ برس میں علوم عربیہ کی تکمیل کی تھی اس عہد کے ہندو مسلمانوں کے تعلقات و ربط کی ایک یہ سبق آموز مثال ہے کہ جناب مفتی محمد لطف اللہ صاحب مرحوم کے استاد فارسی منشی سوہن لال تھے اور مولانائے مغفور کے تلامذہ میں جے بہاری لال کایستھ تھے میں نے بچشم خود دیکھا کہ مولانا کے دوسرے رشید تلامذہ ان کے ساتھ برادرانہ برتاؤ کرتے تھے۔

ہمارے علما کی شان ہمیشہ یہ رہی کہ انھوں نے علم کو علم کے لئے حاصل کیا علوم دین سے انھوں نے خدا اور اس کے رسول کی خوشنودی مقصود رکھی علوم دنیویہ جن کو بہت کم ذریعہ جاہ و حشمت بنایا ان کی خدمت بھی بہ حیثیت معلم کرتے رہے یہ واقعہ زرین تاریخی کارنامہ ہے کہ جب بغداد میں مدرسہ نظامیہ قائم ہوا اور وہاں علما کے گراں قدر مشاہرے اور طلبہ کے لئے بیش قرار وظائف اور سامان آسائش ان کے لئے مہیا کئے گئے تو علمائے بخارا نے علم کی مجلس ماتم منعقد کی اور رو کر کہا کہ اب علم علم کے لئے نہیں بلکہ جاہ و حشمت کے لئے حاصل کیا جائے گا اسی یکسوئی اور وحدت مقصود کا اثر تھا کہ ہمارا علمی گروہ تغیرات زمانہ سے بہت کم متاثر ہوا۔ اگلے زمانے میں جب کہ امن و امان زیادہ و رزاں نہ تھی سلاطین کا انقلاب امرا کا عروج تنزل ملک میں تزلزل پیدا کرتا رہتا تھا لیکن اس کا اثر ترقی علوم پر بہت کم ہوا۔ اس کی آخری مثال دہلی کے محدثین کا خاندان ہے مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے وقت جب ہنگامہ حوادث کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی اور تاج و تخت تاخت و تاراج ہو رہا تھا۔ شاہ ولی اللہ صاحب کا خاندان انتہائی سکون و وقار کے ساتھ علم دین کی خدمت میں منہمک تھا اور اسی دور نے شاہ ولی اللہ صاحب کی ذات میں ایک ایسا حکیم الامت پیش کیا جس کی مثال امام غزالی کے بعد مشکل سے مل سکتی ہے اور ایک اسی خاندان پر کیا حصر ہے۔ دہلی مرحوم کی آخری بہار نے کمال کے بہت سے گل سرسبد نمایاں کئے۔

اس بے تعلقی و یکسوئی کے ساتھ علوم عربیہ عملی دماغ اور کاروباری ذہن پیدا کرنے میں کبھی قاصر نہیں رہے ائمہ مجتہدین کی معاملہ فہمی پر فقہ کے مسائل زبردست گواہ ہیں جو آج بھی قانون کا بہترین سرمایہ خیال کئے جاتے ہیں جن بزرگوں نے خالص دنیاوی کاروبار کی جانب توجہ کی وہ کامیابی کی اعلیٰ منزل پر پہنچے۔ امام یحییٰ ابن اکثم امام حدیث ہیں۔ مامون الرشید کی تاریخ پڑھئے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس یادگار روزگار خلافت کے انتظام میں امام ممدوح کا کیا حصہ تھا، امام ابن ماکولا (علم الرجال کی بے مثل کتاب اکمال کی مصنف) جس طرح نامور امام حدیث تھے اسی طرح ایک کامیاب مدبر وزیر ابن ابی دواد نظام الملک طوسی صاحب ابن عباد وغیرہ وزرائے نامور کی ذات سے ایوان وزارت اور قصر علم دونوں یکساں زینت کے ساتھ مزین تھے۔ ہندوستان کی تاریخ میں عہد اکبری سلطنت کے اعلیٰ نظم و نسق اور مشکل مسائل کے حل کے لحاظ سے ہمیشہ یادگار رہے گا۔ امرائے اکبری کے نورتن کی آب و تاب ابو الفضل فیضی میر فتح اللہ شیرازی حکیم ہمام خانخاناں کے دم سے تھی کیا اس کے یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ ان میں سے ہر ایک عربی مدرسوں میں بوریا نشین رہ چکا تھا اس دور آخر میں بھی جن دماغوں نے تعلیم جدیدہ کا مسئلہ حل کیا وہ قدیم مدارس نے

تربیت یافتہ تھے اور ابھی یہ امر بحث طلب ہے کہ ہمارے جدید تعلیم یافتہ گروہ نے ان سے بہتر کہاں تک مسئلہ تعلیم کو سمجھا ہے اس زمانہ میں ہمارے قدیم علوم کے اساتذہ اور طلبہ دونوں میں یہ خیال دل نشین ہے کہ اگلے علما کی کامیابیوں کا سنگ بنیاد وہ فراغ خاطر اور فراخ دستی تھی جو اس عہد کی قدر دانی کا نتیجہ تھی۔ میں بالا علان کہتا ہوں کہ یہ خیال گزشتہ اہل کمال کی جناب میں گستاخی بلکہ ان پر ظلم ہے ان بزرگوں کے حالات پڑھنے سے آپکو معلوم ہو جائیگا کہ ہم ان سے بہت زیادہ فارغ البال اور امن میں ہیں مثالاً سنئے۔ امام بخاری کو ایام طالب علمی میں ایک مرتبہ تہی دستی کے ہاتھوں مجبور ہو کر تین روز متواتر جنگل کی بوٹیاں کھانی پڑیں امام ابو علی بلخی جب عسقلان میں تھے تو خرچ سے اس قدر تنگ ہوئے کہ کئی فاقوں کی نوبت پہنچی جب بھوک نے بہت ستایا تو نان بائی کی دکان پر اس غرض سے جا بیٹھے کہ اس فقدانِ قوت کی حالت میں کھانے کی خوشبو سے ہی کچھ قوت حاصل کرلیں یہ تو مثالیں فراخ دستی کی ہیں۔ فارغ البالی ملاحظہ ہو علوم عقلیہ میں شفا و اشارات کا جو درجہ ہے اُس سے ہر طالب علم واقف ہے شیخ الرئیس نے اشارات اس حالت میں لکھی کہ جان کے خوف سے ایک لوہار کے گھر میں چھپا ہوا تھا اسی لوہار سے سامان تحریر منگوا کر یہ بےنظیر کتاب لکھدی۔ ہمارے علما کے حالات میں یہی ایک واقعہ نہیں ہے ہزاروں واقعات ایسے گزرے ہیں اصل راز علمائے قدیم کی کامیابی کا وہ شوق طلب تھا جو علمی شیفتگی سے پیدا ہوتا تھا اور یہی شوق منزل کی ہر دشواری کو آسان کر دیتا تھا امام ابو حاتم رازی نے شوق طلب میں نو ہزار میل سفر پیادہ پا کیا تین ہزار تک شمار کرکے انھوں نے میلوں کو شمار کرنا چھوڑ دیا کتاب النفس ارسطو کا ایک نسخہ کسی کے ہاتھ لگا جس پر حکیم ابو نصر فارابی کے ہاتھ کی یہ عبارت تحریر تھی انی قرأت ھذا الکتاب مائة مرة یعنی میں نے اس نسخے کو سو بار پڑھا۔ امام مزنی نے کتاب الامام شافعی کا مطالعہ مسلسل پچاس برس تک کیا اور ان کا بیان ہے کہ ہر دفعہ کے مطالعہ میں نئے فوائد حاصل ہوئے یہ کھلا ہوا راز ہے کہ اب اُس علمی شیفتگی کا نشان بھی نہیں الا ماشاء اللہ اسی لئے مدرسوں میں ہر طرف کمال کا زوال ہے۔

ہمارے علم و کمال کی تصویر کا یہ روشن پہلو تھا دوسرا پہلو بھی دیکھنا باقی ہے زمانے کے انقلاب نے ہماری تعلیم قدیم کا شیرازہ پریشان کر دیا پرانی درسگاہیں مٹ گئیں سلسلۂ تعلیم درہم برہم ہو گیا قدیم اساتذہ کے ساتھ اس کا طریقۂ تعلیم بھی رخصت ہوا۔ علمی خزانے یعنی کتاب خانے جن کی ملک میں کچھ انتہا نہ تھی تباہ و برباد ہو گئے جو سرمایہ بچا وہ یورپ و امریکہ کی قدر دانی کی بدولت وہاں کے کتاب خانوں کی زینت بن گیا۔ ان تمام اسباب کا یہ نتیجہ ہوا کہ ارادوں میں سستی، حوصلوں میں پستی پیدا ہو گئی تعلیم کی غرض و غایت بجائے حصول علم و کمال کے چند کتابوں کی عبارت و الفاظ میں منحصر ہو گئی جن میں کثیر حصہ تخیلات کا تھا اس تعلیم کے اثر نے بحث و مباحثے کی نوبت نزاع و خصومت تک پہنچا دی اور ہر طرف جھگڑوں اور مخالفتوں کے معرکے گرم نظر آنے لگے اسی کے ساتھ جدید تعلیم کے اثر نے جدید و قدیم خیال کے دو گروہ علیحدہ علیحدہ ہم میں پیدا کر دئے ہندوستان کے قدیم شرفا کے خاندان جو علوم قدیمہ کے ملجا و ماوا تھے زمانہ کی ضرورتوں سے مجبور ہو کر خانقاہوں اور مدرسوں سے نکلکر اسکولوں اور کالجوں میں جا پہنچے ایک زمانے میں میں نے عربی مدارس کے طلباء کی مردم شماری بہ لحاظ وطن اور مسکن کے کی تھی اُس سے معلوم ہوا کہ خاص ہندوستان کے طلبہ کا وجود اُن مدرسوں میں مفقود تھا صرف آفاقی طلبہ کے دم سے

اُن کی رونق باقی تھی۔

اس پست حالت کا احساس بعض اُن اہلِ دل کو ہوا جو علوم قدیمہ کے ساتھ ساتھ حالاتِ جدیدہ کے احساس کی قابلیت دماغ میں اور تباہیٔ ملت کا درد دل میں رکھتے تھے ان بزرگوں نے ۱۳۱۱ھ میں جس کو آج پچیس برس کا زمانہ گذرا اس مجلسِ عالی کی بنیاد ڈالی جن آنکھوں نے ندوۃ العلما کا پہلا اجلاس دیکھا ہے وہ تصدیق کر سکیں گے کہ وہ منظر سرزمین ہند میں اپنی آپ نظیر تھا۔ مختلف خیال و عقائد کے علما اس مقصد سے جمع ہوئے کہ نفسانیت اور خصومت کو خدمتِ ملت کی خاطر علیحدہ رکھکر علوم عربیہ کی ترقی اور تباہ کن نزاعوں اور جھگڑوں کی بیخ کنی کی تدابیر پر غور کریں غالباً ہندوستان میں کوئی حصہ ملک اور فرقہ علما ایسا نہ تھا جس کے قائم مقام اس اجلاس میں کشادہ دلی اور وسعتِ خیال کے ساتھ شریک نہ ہوئے ہوں۔ ابتداءً ندوۃ العلماء کے دو مقصد تھے رفعِ نزاعِ باہمی اور نصابِ تعلیم کی اصلاح۔ آج سے پچیس برس پہلے کے حالات اور عدالتوں کے دفتروں کی اگر چھان بین کی جائے تو عیاں ہو سکتا ہے کہ مختلف فرقوں کی مذہبی جنگ و جدل کی اس وقت کیا حالت تھی ندوۃ العلما کا مقصود یہ تھا کہ مذہبی مباحثوں میں مناظرہ کی شان رہنی چاہئے مکابرہ اور مجادلہ تک نوبت نہ پہنچے ہر فرقہ کو مذہبی مباحثوں میں یہ امر ملحوظ رکھنا چاہئے کہ جو امر اُن کے نزدیک حق ہو اُس کو شانِ علم و تہذیب کا لحاظ رکھکر بیان کریں یہ نہ ہو کہ مباحث کی نوبت نفسانیت اور جدل تک پہنچ جائے جس سے اصل مقصود فوت ہو کر محض فتنہ و فساد باقی رہ جائے۔

خلاصہ یہ کہ اختلاف و نزاع کے اس نازک فرق کو پیش نظر رکھنا چاہئے جو تابعی جلیل القدر یحییٰ بن سعید نے اِس مقولے میں متعین فرمایا ہے اهل العلم اهل توسعة وما برح المفتون يختلفون فيحل هذا ويحرم هذا فلا يعيب هذا على هذا یعنی علما اہلِ وسعت ہیں اور مفتی ہمیشہ باہم اختلاف کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ایک ایک چیز کو حلال بتاتا ہے۔ دوسرا حرام لیکن ایک دوسرے کی عیب گیری نہیں کرتا حضرت امام جعفر صادق کا کس قدر پاکیزہ مقولہ ہے اياكم والخصومة في الدين فانها تشغل القلب وتورث النفاق یعنی دین میں جھگڑنے سے بچو اس لئے کہ یہ جھگڑا دل کو (کام کی باتوں سے) باز رکھتا ہے اور نفاق پیدا کر دیتا ہے۔ چونکہ یہ مبحث بہت نازک ہے اس لئے اس موقع پر اس سے زیادہ بحث کرنا مناسب نہیں ہے ندوۃ العلما کی کوشش اور سعی اس مقصد کے حاصل کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوئی اس کو اس بین فرق نے ثابت کر دیا جو اب کو مذہبی نزاعوں کی شدت میں نظر آیا دوسرے سالانہ اجلاس ندوۃ العلما میں مشرقی اضلاع کے دو زبردست اور ذی اثر عالموں کی باہمی مصالحت ہمیشہ یادگار رہے گی اس مصالحت نے ہزاروں مسلمانوں کی تباہی کو روک دیا چند ہی روز کے بعد جب ندوۃ العلما کو خود ان نزاعوں کی زد میں آنا پڑا تو پورے ضبط و استقلال کے ساتھ اُس نے اپنے مقصد کو پیش نظر رکھا اور ایک سطر بھی اُس کی جانب سے ایسی نہیں لکھی گئی جو اس مقصد کے منافی ہوتی۔

اسی وسعتِ خیال کا نتیجہ وہ ربط و انبساط ہے جو ندوۃ العلما کی سعی سے علما اور جدید تعلیم یافتہ گروہ میں پیدا ہوا پٹنہ کا اجلاس ندوۃ العلما اس اعتبار سے ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ان دونوں گروہوں میں وہاں مصالحت ہوئی اُس موقع پر ہمارے مخدوم مولنا شاہ سلیمان صاحب نے اپنے مخصوص لہجہ میں بلبل شیراز کا

یہ شعر اہلِ جلسہ کو سنایا تھا ؎

شکر للہ کہ میانِ من و او صلح فتاد
حوریاں رقص کناں ساغرِ پیمانہ زدند

الحمدللہ کہ وہ صلح اب تک قائم ہے اور اُس کے آثار اس اجلاس میں بھی نمایاں ہیں۔

دوسرا مقصد ندوۃ العلما کا عربی نصابِ تعلیم کی اصلاح تھی۔ میں نے اوپر عرض کی ہے کہ ہندوستان میں علوم عربیہ مختلف ممالک سے آئے تھے قدرتی طور پر ان ملکوں میں جن علوم کا چرچا تھا وہی ہندوستان کے مختلف حصوں میں رائج ہوئے سندھ میں سلسلۂ علم خراسان اور ماوراءالنہر (ترکستان) سے آیا ان ممالک میں فقہ اور معقولات کو بہت ترقی تھی لہٰذا جب ملتان مرکزِ علم بنا تو وہاں کی درس تدریس میں ان علوم کا عنصر غالب تھا دو سو برس تک یعنی ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں نصابِ تعلیم اسی رنگ میں رہا۔ اس عہد میں علم نحو، بلاغت، فقہ، تصوف، اور تفسیر معیارِ فضیلت خیال کئے جاتے تھے۔ حدیث ادب وغیرہ برائے نام پڑھائے جاتے تھے نویں صدی ہجری میں دارالعلوم ملتان کو زوال ہوا۔ یہاں سے علما ملک کے مختلف حصوں میں گئے ان بزرگوں میں مولنا عبداللہ تلبنی نواحِ دہلی میں آئے اور اُن کے شاگرد مولنا عزیز اللہ سنبھل پہنچے یہ زمانہ سکندر لودی کی سلطنت کا تھا سلطانِ مذکور نے ان دونوں بزرگوں کی تشریف آوری ایک نعمت غیبی سمجھی اور اُن کے واسطے درسگاہیں مہیا کیں اُس کو اُن کے درس سے اس قدر شوق تھا کہ کبھی کبھی مدرسہ میں آتا اور کسی گوشہ میں چھپکر اُن کا پڑھانا سنتا ان دونوں اہلِ کمال نے قدیم نصابِ تعلیم میں تغیر کیا مولنا عبداللہ تلبنی مولنا عبدالحکیم دی شارح تہذیب کے شاگرد تھے اس لئے قدرۃً منطق کا پلہ زیادہ بھاری ہوا نیز علامہ تفتازانی اور میر سید شریف کی تصانیف شاملِ درس کی گئیں دسویں صدی ہجری کے آخر میں محقق دوانی صدر شیرازی اور میرزا جان شیرازی کے تصانیف ہندوستان میں پہنچکر داخلِ درس ہوئیں اور معقولات کی تعلیم کا دور دورہ پہلے سے بھی زیادہ ہوگیا۔ اس ترقی علمی میں نمایاں حصہ میر فتح اللہ شیرازی کا ہے جو اکبری نورتن میں تھے۔

اسی طبقۂ علما میں علامہ قطب الدین سہالی تھے جو علمائے فرنگی محل کے مورث ہیں اسی زمانہ میں بعض اہلِ علم ملک عرب تشریف لیگئے اور وہاں سے علم حدیث حاصل کرکے ہندوستان واپس آئے ان بزرگوں میں شیخ محمد طاہر صاحب مجمع البحار شیخ یعقوب کشمیری اور شیخ عبدالنبی گنگوہی قابلِ ذکر ہیں چونکہ گجرات میں علما ملک یمن سے بھی آیا تھا اس لئے وہاں علم حدیث کا درس جاری تھا ہندوستان سے کچھ علما گجرات گئے اور وہاں سے علم حدیث پڑھکر مراجعت کی غرض اس طرح دسویں صدی ہجری میں علم حدیث کو بھی ایک حد تک رواج ہوا (مگر معقولات میں علما اور طلبا کی محویت کی وجہ سے بہت کم ہوا) بالآخر شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی مساعی جمیلہ نے فیض کے دریا بہائے اور ایک مخلوق کو علم حدیث سے بہرہ یاب کیا بلحاظ نظامِ درس یہ تیسرا طبقۂ علما تھا۔

بارھویں صدی ہجری میں چوتھے طبقے کا آغاز ہوا۔ استاذ الہند ملا نظام الدین صاحب نے نصابِ تعلیم میں جدید تغیر کیا اور وہ نصاب مرتب فرمایا جو آج تک درسِ نظامی کے نام سے مشہور اور تمام مدارس میں کمی بیشی کے ساتھ رائج ہے اس نصابِ تعلیم سے زیادہ تر مقصود یہ تھا کہ اس سے طلبہ میں دقتِ نظر اور قوتِ مطالعہ

پیدا ہو۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ بوجہ احسن یہ مقصد درس نظامیہ
سے حاصل ہوا۔ اسی دور میں دہلی میں شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم
نے علم حدیث کی ترویج پر کمر ہمت باندھی اور ہمارے ملک کا
بچہ بچہ اس سے واقف ہے کہ شاہ صاحب کی کوشش میں
خداوند تعالیٰ نے برکت عظیم عطا فرمائی اور اس خاندان کی
سعی سے ہندوستان دار الحدیث بن گیا ملا نظام الدین
صاحب کے بعد درس نظامی میں کتب منطق کا اضافہ کثیر کیا گیا
اور وہ کتابیں پڑھائی گئیں جو درس نظامیہ کے تدوین کے وقت
تصنیف بھی نہ ہوئی تھیں مثلاً حاشیہ غلام یحییٰ، قاضی مبارک
حمد اللہ وغیرہ ذلک اس کے متعلق ایک عجب واقعہ ہے۔ شارحین
سلم العلوم کے تلامذہ اپنے استادوں کے شروح پڑھتے
پڑھاتے تھے اور ان میں باہم اس پر نزاع رہتا تھا کہ کس کی
شرح بہتر ہے مدرسین جب اس سے تنگ آ گئے تو انھوں نے
سب شرحیں داخل درس کر دیں اس طرح سلم العلوم کے
شروح وحواشی گویا تمام درس نظامی پر حاوی ہو گئے۔
(ان تمام معلومات کے لئے میں اپنے محترم حکیم سید عبد الحی صاحب
ناظم ندوۃ العلماء کا ممنون ہوں)۔

مذکورۂ بالا بیان سے آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ کس طرح صدیوں
تک منطق وحکمت کا اضافہ ہمارے عربی مدارس کے نصاب
میں ہوتا رہا۔ ان فنون کی خالص کتابیں درکنار قریباً تمام
باقی علوم کی بھی وہی کتابیں داخل درس ہونے کے قابل سمجھی
گئیں جو علوم معقول سے مالا مال تھیں اور اس طرح اول سے
آخر تک منطق کا سکہ مدارس عربیہ پر بیٹھا ہوا تھا ندوۃ العلماء جس
وقت قائم ہوا اس وقت نظام درس کی یہ حالت تھی کہ طلباء
کی عمر کا کثیر حصہ منطق کی تحصیل میں صرف ہوتا تھا (فن منطق کی
تحصیل نہیں بلکہ ان سنگ لاخ کتابوں کی تحصیل میں جو گو شامل
منطق تھیں مگر ان میں وہ مسائل تھے جن کو منطق کے مسائل
نہیں کہہ سکتے مثلاً وجود علم وغیرہ کے متعلق مباحث) ادب
عربی کی بہت سی معرکۃ الآرا کتابیں داخل درس تھیں اور
طلبہ ان کو نہایت جانفشانی سے پڑھتے تھے تاہم عربی عبارت
لکھنے یا بولنے سے عاری رہتے تھے قرآن مجید کی خدمت بہت
کم تھی یہ کھلا ہوا راز ہے کہ جو دماغ ذوق معقول میں سرشار تھے
وہ منقول کو اس نظر سے دیکھتے تھے کہ اس سے ذہن میں سطحیت
پیدا ہوتی تھی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگلے اساتذہ کی طرز
تعلیم اور صحبت کی برکت بہت کچھ نشۂ معقول کے حق میں تریاق
کا کام دیتی تھی اسی کے ساتھ ساتھ قریباً ہر درس گاہ عظیم کے ساتھ
خانقاہ بھی لگی ہوتی تھی جو اخلاق کی صفائی اور باطن کی
پیراستگی میں اکسیر کا حکم رکھتی تھی اور طلبہ مدرسوں سے
فارغ ہو کر خانقاہوں سے فیض حاصل کرتے تھے۔

انقلاب زمانہ سے یہ سامان اصلاح تو مفقود ہو گئے منطقی
کتابوں کا بار گراں طلبہ کے دوش پر رہ گیا اسی کے ساتھ
ساتھ زمانہ کی جدید ضرورتیں اس امر کی متقاضی تھیں کہ طلبہ کا
کچھ بوجھ ہلکا کیا جائے تاکہ وہ ان ضرورتوں کی جانب توجہ
کر سکیں یہ اسباب تھے جنھوں نے ندوۃ العلما کے مقاصد
میں اصلاح نصاب تعلیم کو داخل کیا اور اراکین ندوہ نے یہ
عزم کیا کہ علمائے سلف کی سنت قدیم کے مطابق نصاب تعلیم
میں ضروری ترمیم فرمائیں ابتداءً اس مقصد کی مخالفت ہوئی
تاہم ندوۃ العلما نے اس زمانہ کے مشہور اساتذہ (مثلاً مولنا
لطف اللہ صاحب مولنا محمد فاروق صاحب مولنا
احمد حسن صاحب) کی مدد و منظوری سے پوری بحث و جانفشانی

کے بعد نصاب تعلیم ترمیم کرکے ملک میں شائع کیا۔ ندوۃ العلما نے
خیال کیا کہ اس حد پر پہنچکر اُس کا فرض ادا ہوگیا لیکن تجربہ نے
بتایا کہ صرف رہنمائی کافی نہیں چلنے کے واسطے سڑک بھی تیار
کرنی ہے اور چلنا بھی سکھانا ہے۔ اسی خیال سے ایک بڑے
دار العلوم کے قیام کا ارادہ کیا گیا۔ اس کی پوری شکل رسالہ کی
صورت میں شائع کی اور لکھنؤ میں خدا کا نام لے کر دار العلوم
کھول دیا۔ گورنمنٹ عالیہ نے اراضی نزول کا ایک نہایت
خوش فضا اور ہوادار قطعہ عطا کیا ہز ہائینس نواب صاحب
بھاولپور کی دادی صاحبہ نے پچاس ہزار روپیہ عمارت کے
واسطے مرحمت کیا۔ لکھنؤ میں شہر سے دور ایک صحت بخش مقام
پر لبِ دریا آپ ایک شاندار عمارت دیکھیں گے جس میں اساتذہ اور
طلبہ نصابِ جدید کی تعلیم و تعلم میں مصروف ہیں قیام دار العلوم
کے ساتھ ہی ندوۃ العلما نے یہ بھی ارادہ کیا کہ قدیم کتابوں کے
جو سرمائے دست برد زمانہ سے بچ رہے ہیں وہ دار العلوم میں
فراہم کرکے کتاب خانہ قائم کیا جائے۔ چنانچہ کئی سال کی کوشش
میں ایک نادر ذخیرہ کتابوں کا فراہم ہو چکا ہے۔

جدید نصاب تعلیم کے اجرا میں گوناگوں دقتیں پیش آئیں تاہم
مسلسل کوشش بیکار نہ رہی اور تلامذہ دار العلوم کا ایک خاصہ
گروہ ملک میں خدا تعالیٰ کے فضل سے موجود ہے جو ذوق علمی کے
ساتھ تلاش و تحقیق کا شایق۔ کتابوں کا کیڑا نہیں بلکہ علم کا دلدادہ
ہے تقریر و تحریر پر پوری قدرت رکھتا ہے جن اہل علم نے دار العلوم
کے فراغت یافتہ عالموں کی تحریریں دیکھی ہیں وہ کہہ سکیں گے

ع
این زمیں را آسمانے دیگر است

یہ زور تحقیق دوسری جگہ کمتر نظر آئے گا۔ دار المصنفین اعظم گڈھ کا
ماہوار رسالہ "معارف" میرے دعوے کی برہان قاطع ہے۔
بارک اللہ فیھم دوسرے عربی مدارس میں اگرچہ
ندوۃ العلما سے اس مقصد سے مخالفت کی گئی لیکن جو
غائر نگاہیں تدریجی تغیرات کو جانچ لیتی ہیں وہ پکار اٹھیں گی
کہ بڑی بڑی قدیم درسگاہوں کے نظام تعلیم میں ندوۃ العلما
کی مثال نے تغیر عظیم پیدا کر دیا ہے میرے ایک ثقہ محترم
دوست نے ایک ایسے عربی مدرسہ میں ندوۃ العلما کا نصاب تعلیم
اُستادوں کے پیش نظر پایا جہاں کوئی ندوہ کا نام بھی لینے کی
جرأت نہیں کرسکتا شکر ہے کام ہو رہا ہے نام نہ ہو تو نہ ہو

ع
مانمی خواہیم ننگ و نام را

ندوۃ العلما کے نصاب تعلیم کی خصوصیات یہ ہیں کہ معقول
کا غیر ضروری بار کم کرکے دینی علوم کو ترقی دی گئی ہے خصوصاً
علم تفسیر کو ادب پر بھی خاص توجہ کی گئی ہے تاکہ طلبہ میں مذاق
ادب پیدا ہو اور بقول مولانا فیض الحسن صاحب مرحوم کے
بے ادب نہ رہ جائیں عربی لکھنے اور بولنے پر قادر ہوں۔
فن تاریخ جو مسلمانوں کا سرمایۂ ناز ہے شامل درس کیا گیا ہے
جس سے طلبہ میں مورخانہ تحقیقات کا شوق پیدا ہو جدید
علوم سے بھی طلبہ واقف کئے جائیں جدید علم کلام پڑھایا
جائے تاکہ فلسفۂ جدید کے اعتراضات اور اُن کے مقابلہ
میں تائید مذہب کے طریقوں سے طلبا واقف ہوں آخر
عام اُصول یہ پیش نظر رکھا گیا ہے کہ طلبہ کے دماغ علمی مسائل
سے معمور ہوں۔ محض ضمیروں کے مرجع اور اشاروں کے
مشار الیہ سمجھنے اور ذہنی تشقیقات پیدا کرنے پر اُن کے
علم کا دارومدار نہ ہو یہ ایسے روشن اور معقول اُصول ہیں کہ کوئی

ذی فہم ان کے ضروری اور واجب العمل ہونے سے انکار نہیں کرسکتا ندوۃ العلما نے اس رمز کو بھی سمجھا کہ تمام فنون کی تکمیل ناممکن ہے۔ لہذا انتہائی تعلیم میں نصاب ایسا تجویز کیا گیا کہ طلبہ اس کو پڑھکر کسی خاص فن کی تکمیل کرسکیں یہ ظاہر ہے کہ خداوند تعالیٰ نے انسان کی ذات میں مختلف قابلیتیں ودیعت رکھی ہیں اور ان قابلیتوں کا رجحان خاص خاص علوم کی جانب ہوتا ہے نصاب تکمیل کی تجویز سے یہ فائدہ عظیم حاصل ہوا کہ جو طلبہ جس علم سے مناسبت رکھتے ہیں اپنی پوری دماغی قوت اس کی تحصیل میں صرف کرسکتے ہیں طلبائے عربی کی ماندو بود کا طریقہ بھی قابل اصلاح تھا اور اس کا برا اثر جمعیت و شرافتِ نفس پر پڑتا تھا۔

اسی لئے ندوۃ العلما نے دار العلوم کا جزو غیر منفک دار الاقامہ کو قرار دیا اور اس کے آئین و ضوابط ایسے رکھے گئے جن سے طلبہ میں مردانہ اوصاف کو ترقی ہو یک جائی بود و باش باہم ربط و ہمدردی پیدا کرے اور ہمارے طلبہ ملک میں اتحاد و کشادہ دلی کا عمدہ نمونہ پیش کرسکیں۔ ندوۃ العلما نے اس ضرورت کو بھی محسوس کیا کہ کیا بہ لحاظ ضرورت زمانہ اور کیا بہ لحاظ ایک علمی زبان ہونے کے انگریزی زبان کی تحصیل ضروری ہے۔

اس لئے یہ انتظام بھی کیا گیا ہے کہ جو طلبہ چاہیں انگریزی بطور زبان ثانی حاصل کرسکیں۔ یہ سنکر آپ مطمئن ہوں گے کہ اس طرز تعلیم کی بدولت ندوۃ العلما کے ایسے شاگرد موجود ہیں جنھوں نے علوم عربیہ کی تکمیل کے بعد یونیورسٹی کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی اور اب معزز تعلیمی عہدوں پر ممتاز ہیں یہ واقعہ بھی کم حسرت کے لائق نہیں کہ ندوۃ العلما کے نصاب تعلیم کو مفید و کارآمد دیکھکر ان شریف خاندانوں کے بچے (جو عربی مدارس کو خیرباد کہہ چکے تھے) ہمارے دار العلوم میں تحصیل علمی میں مشغول ہیں اس طرح آپ خیال کر سکتے ہیں کہ جو کام فرداً فرداً جدید و قدیم درسگاہوں کے امکان سے باہر تھا وہ ندوۃ العلما کی کوشش سے پورا ہوسکا

ندوۃ العلما کی مالی حالت کا بھی مختصر طور پر عرض کر دینا ضروری ہے اس سال جو بجٹ شایع کیا گیا ہے اس میں تخمینہ آمدنی مبلغ ۳۲ ہزار درج ہے اس آمدنی میں گورنمنٹ عالیہ ریاستِ حیدرآباد بھوپال و بہاولپور کے مستقل عطئے جائداد موقوفہ کی آمدنی وغیرہ شامل ہیں ایک مد خاص وظائف کی آمدنی کی ہے۔ جس میں بزرگانِ قوم غیر مستطیع طلبہ کے وظائف کے لئے چندہ عطا فرماتے ہیں اس مد کی آمدنی کی تفصیل پڑھنے سے یہ مسرت ہوتی ہے کہ صوبہ مدراس کا قدم تمام صوبوں سے بڑھا ہوا ہے ندوۃ العلما کا صیغہ مال مجلس مال کے ماتحت ہے جلسہ انتظامیہ کے ایسے ارکان جو مالی امور میں تجربہ و مہارت رکھتے ہیں اس مجلس کے ممبر ہوتے ہیں۔

موجودہ حالت ندوۃ العلما کی ضروریات کی یہ ہے کہ عمارت دار العلوم کی تکمیل نہیں ہوئی۔ مسجد (جو مسجد نبوی کے نقشہ کے مطابق بنی تجویز ہوئی ہے) زیر تعمیر ہے۔ بورڈنگ کی اشد ضرورت ہے اس وقت طلبا درسگاہ کے بعض کمروں میں رہتے ہیں اور اس وجہ سے جو فوائد دار الاقامہ میں رہنے سے حاصل ہوتے ہیں وہ پوری طرح حاصل نہیں ہوسکتے جس نادر کتاب خانہ کا میں نے ذکر کیا وہ اب تک دار العلوم سے دور شہر میں ہے اور اس طرح اس کے فیض سے مدرسین و طلبا دونوں کما حقہ بہرہ یاب نہیں ہوتے بہر حال متعدد حیثیتوں سے ندوۃ العلما کو اہل دل کی توجہ اور مالی مدد کی ضرورت ہے۔

میں خاتمہ میں خداوند علیم و حکیم کی بارگاہ میں دعا کرتا ہوں کہ یہ جلسہ خیر و خوبی سے کامیاب ہوا اور ملک و ملت کی ترقی میں اس کے آثار خیر و برکت ثابت ہوں

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ؁

تحفۃ الصغر پر ایک نظر

یعنی حضرت امیر خسروؒ کے پہلے دیوان کی تاریخی تنقید

شاعر ماں کے پیٹ سے شاعری کا ملکہ لیکر پیدا ہوتا ہے وہ اس سے پیشتر شاعر ہوتا ہے کہ اُسے اپنے شاعر ہونیکا علم ہو سکے اس کی فطرت میں شاعری کا آتش گیر مادہ ودیعت ہوتا ہے اور یہ مادہ ذراسی تحریک سے مشتعل ہو جاتا اور اس کی نوا سنجی کا باعث بن جاتا ہے۔ ناموافق حالات و حوالی شاعر کے فطری جوش کو نہیں دبا سکتا۔ باطنی قوت اُبھرتی ہے اور بالآخر خارجی قیود پر غالب آجاتی ہے :-

امیر خسرو کے حالات سے شاعری کی اس عجیب و غریب ملکہ کی حیرت انگیز کیفیت ظاہر ہوتی ہے گرد و پیش کے تمام حالات اور ظاہری اسباب ہر طرح ناسازگار تھے اُن کی رگوں میں ترکی اور ہندی خون تھا لیکن شمشیر آزماؤں اور سورماؤں کا خون تھا۔ باپ لاچینی نسل کے ایک اَن پڑھ ترک سپہ سالار تھے جنھوں نے ساری عمر تلوار چلائی اور اپنی جان بھی تلوار ہی کے نذر کی۔ نانا راوت یعنی ذات کے چھتری تھے جو پون صدی تک سلطنت کی فوج کے بخشی رہے کون کہہ سکتا تھا کہ سیف شمشی کا بیٹا اور عماد الملک راوت کا نواسہ جو پٹیالی جیسے کور دہ میں پیدا ہوا تھا۔ سلطان الشعراء طوطی ہند کہلائے گا اور دنیا اس کے کمال کے سامنے گردن جھکائیگی

کارخانۂ قدرت سراسر اسرار نامتناہی سے گھرا ہوا ہے اسباب و علل کی عقدہ کشائی پر ہماری دسترس نہایت محدود ہے عقل و وہم کے لئے اُن قوانین کی تہ تک پہنچنا خارج از امکان ہے جو دنیا کی بڑی ہستیاں ان نامعلوم طریقہ پر پیدا کرتے ہیں :-

جس دن سے امیر خسرو کو یارائے گویائی ہوا اُسی وقت سے شعر زبان پر جاری ہونے لگے "الشعراء تلامذ الرحمن" کسی کی تربیت درکار نہ تھی فطرت کی رہبری میں ارتقائے ذہنی کے مراحل خود بخود طے ہو گئے۔

دیباچہ تحفۃ الصغر میں کہتے ہیں :-

ع‍ہ تعجب ہے کہ آج تک کسی مورخ اور تذکرہ نویس نے اس کا ذکر بھی نہیں کیا کہ امیر کی رگوں میں ہندی خون بھی شامل تھا خود امیر نے بھی کھلے لفظوں میں ایسے کہیں نہیں بیان کیا البتہ اپنے آپکو ترک ہندوستانی کبھی کبھی لکھا ہے لیکن بیشتر آبائی نسبت سے خسرو لاچین لکھتے ہیں غرہ کے دیباچہ میں جہاں نانا کا ذکر کیا ہے وہاں راوت کا لفظ ایک جگہ اُن کیلئے لکھا ہے برنی نے عماد الملک کے نام کے ساتھ راوت لکھا ہے (دیکھو فیروز شاہی) یہ لفظ اس عہد کی تاریخ میں بہت متداول ہے اور امیر نے اسے بارہا استعمال کیا ہے مثلاً قران السعدین میں ایک جگہ لکھتے ہیں ع راوت ترو پیر زن خار اشگاف۔ بینک قران السعدین کے ایک شارح نے لکھا ہے چھتریوں یعنی راجپوتوں میں عالی قدر شرفا قوم کیلئے یہ لفظ مستعمل ہوتا تھا۔

"چوں مرا اُستادے سر آمد بر سر نیامدہ بود کہ بر سر دقائق دال شدے و آہوئے مشکبار قلم را از سواد خطا باز آوردے ...... چوں طوطیانِ نو آموز آئینۂ تخیل را پیش داشتم و از خیالے کہ در تصور می آمد سخن می آموختم۔ یک چند آئینہ دل آہنی بصیقل کوشش بزدودم.... و مجلدات استاداں را پیوست در رقم فتم کارحلاوتے بحاصل آمد و لذت سخن کامگار گشت"

اپنی اس وہبی استعداد سے وہ خود بھی متحیر تھے :۔

حیران طبع خودم..... بارہا از موج تخیل در بحرہائے افتم کہ کالِ غوراں نیابند، و بے آنکہ غور کند بار بیجے برم از بحرِ سخن چنداں لآلی غلطاں و آبدار در مشتِ تخیل گرد می آید کہ گرو نمی توانم آورد" (دیباچہ بقیہ نقیہ)

اور بچپن ہی میں فخر کا حق حاصل ہو گیا تھا ع

سلطانے سلطاں سلاطین کمال است
(تحفۃ الصغر)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

در قرانہا نظیرِ سلطانی ❊ زیں مضیق خراب نتواں یافت
(تحفۃ الصغر)

اپنی نکتہ سنجی پر دوسری جگہ اس طرح ناز کیا ہے ؎

از زبانِ کلکش من سوا جہا
در دل لولوئے عمانی شد است
(تحفۃ الصغر)

صغر سنی اور طفولیت کا زمانہ مشق کا زمانہ تھا اس زمانہ میں انہماک و توغل کی انتہائی حالت کو انھوں نے خود بیان کیا ہے

سنِ بوالہوس خود بہوس طبعی خود چناں راغب
آں بر غائب غرائب بودہ ام کہ شام تا صبح
چوں قلم فرو کردہ دود چراغ می خوردم و شب و روز

سواد بیاض را نقش دیدہ ساختہ..... ہر جا کہ نظمے
چو آب زرمی دیدم عاقبت جوابے رواں می کردم
و ہر دیوانے کہ ناظر شدم ہمبراں سیاقت تقریر بہ تحریر
رسانیدم (دیباچہ تحفۃ الصغر)

ارتقائے ذہنی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ جانے پر اُن کی نظر میں بچپن کا کلام کیا جچ سکتا تھا وہ اُسے محفوظ رکھنا نہ چاہتے تھے لیکن اپنے مخلص بھائی تاج الدین زاہد اور احباب کے اصرار پر نظرِ ثانی کے بعد صغر سنی کے اخیر چند سالوں کا کلام انتخاب کر کے تحفۃ الصغر میں یکجا کر دیا[۱] انہیں اس وقت خیال بھی نہ ہوا ہوگا کہ مورخ اور عالم علم النفس کے لئے اُن کی تمام تصانیف میں سب سے زیادہ دلچسپ یہی مجموعہ ہے جس سے اُس تعجب انگیز استعداد شاعرانہ کا اظہار ہوتا ہے جو بدو شعور سے اُن کی رفیق حال تھی عالمِ طفلی کے معمولی حرکات و سکنات سے بھی معنی خیز نتائج مستنبط ہوتے ہیں اور نفسِ انسانی کے دقیق اور عمیق اسرار پر روشنی پڑتی ہے۔

بچوں کو کھیل کود کے طور پر الٹی سیدھی لکیریں کاڑھنے اور کیڑے مکوڑے بنانے کا شوق ہوتا ہے نفسیات کا مبصر ان نقوش اولین سے ملکاتِ ذہنی کا پتہ لگا تا اور مشاہدہ و ادراک اور تخیل و اختراع کی قوت کا اندازہ کر لیتا ہے ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ خسرو نے صرف سولہ سے بیس برس تک کا کلام محفوظ رکھا اور باقی کو اس قابل نہیں سمجھا کہ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے کیا اچھا ہوتا کہ ہم اُن اشعار سے بھی لطف اندوز ہو سکتے جن سے مکتب میں مشق خط کے بہانے مشق سخن ہوتی تھی یقین ہے کہ ان نقوش اولین میں بھی خسرو کے خط و خال صاف نظر آتے۔ آتھیسر نے بیس برس کی عمر تک اپنی

---

[۱] دیباچہ تحفۃ الصغر

شاعری کا بچپن قرار دیا ہے۔ جس شخص نے ستر برس شاعری کی اور آخیر دم تک قلم ہاتھ سے نہ رکھا بیس برس تک اس کی شاعری کا بچپن ہی سمجھنا چاہئے لیکن یہ یاد رہے یہ وہ بچپن ہے جو دوسروں کے عہد کمال سے ٹکر کھاتا ہے۔

سولہ برس کی عمر میں جس زمانہ سے تحفۃ الصغر کا کلام شروع ہوتا ہے خسرو کو تمام اصناف شعر پر دستگاہ حاصل ہوچکی تھی "سلطانی" ان کا ابتدائی تخلص ہے اور تحفہ میں بیشتر قصائد اور بعض غزلیات اسی تخلص کے ساتھ ہیں اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دوسرا تخلص "خسرو" غالباً سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں اختیار کیا۔

امیر کی ولادت ناصر الدین محمود (۶۴۴ھ تا ۶۶۴ھ) کے عہد میں ہوئی تھی ان کی پیدائش سے تیرہ برس بعد محمود کا انتقال ہوگیا اور غیاث الدین بلبن تخت نشین ہوا اور بائیس برس تک (۶۶۴ھ تا ۶۸۶ھ) اس نے نہایت جاہ و جلال کے ساتھ حکومت کی۔ تحفہ کا کلام عہد بلبن کے تیسرے چوتھے پانچویں اور چھٹے سالہائے جلوس یعنی ۶۶۸ھ لغایت ۶۷۱ھ میں لکھا گیا۔ عہد ناصری کی کوئی نظم اس میں بظاہر شامل نہیں ہے۔

امیر کا یہ زمانہ پوری آزادی کا تھا جو بعد میں پھر میسر نہیں آیا۔ باپ کا انتقال تو سات ہی برس کی عمر میں ہوچکا تھا۔ خوش نصیبی سے نانا زندہ تھے انھوں نے باپ کے برابر سرپرستی کا حق ادا کیا۔ انیسویں یا بیسویں برس[1] ایک سو تیرہ برس کی عمر میں ستر سال نہایت عزت کے ساتھ عارض ممالک رہنے کے بعد ان کا بھی انتقال ہوگیا۔

تحفہ میں ان کے مرثیہ میں ایک پردرد ترجیع بند موجود ہے ان کی انتقال پر امیر کا اشکبار ہونا بجا تھا۔ باپ کا غم تازہ ہوگیا دنیا میں کوئی سرپرست نہ رہا اور تلاش معاش کی فکر دامنگیر ہوئی آہ اسی دن ان کی بچپن اور آزادی کا زمانہ ختم ہوگیا۔ کس درد کے ساتھ نانا کو مخاطب کرکے کہا ہے

> خسرو کہ پار بُد ز بقایت بزرگ اُمید
> امسال صوبجان غمش کرد ہمچو بید

تحفۃ الصغر میں سلطان غیاث الدین اور ولی عہد سلطنت نصرۃ دین قاآن ملک سلطان محمد کی تعریف میں ترجیع بند اور قصائد ہیں اور حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کی منقبت میں ایک بہت عمدہ ترجیع بند ہے جس کی تشبیب خاص طور پر قابل لحاظ ہے

> شاہِ نوروز در آمد در شہر صیام
> اے دریغا کہ نشاط است درین شہر حرام

دربار بلبن سے براہ راست امیر کا کبھی ذاتی تعلق پیدا نہیں ہوا اور شاہزادہ مذکور سے اس زمانے سے نو دس برس بعد روابط قائم ہوئے تحفہ میں محض مشق و طبع آزمائی کے لئے بطور خود مدح سرائی کی ہے لیکن بارگاہ مرشد سے رابطۂ خلوص اسی زمانہ

---

[1] دیباچۂ غرہ ۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ دیباچہ غرہ میں بیس برس لکھے ہیں لیکن چونکہ تحفہ میں انیسویں برس تک کا کلام ہے اس لئے انیسویں برس زیادہ صحیح ہے [2] دیکھو دیباچۂ غرہ تاریخ فیروز شاہی مصنفۂ ضیاء برنی میں جو خسرو کا معاصر درج ہے امرائے عہد بلبنی میں عماد الملک راوت کا مفصل حال لکھا ہے۔

میں قائم ہوا۔ حضرت محبوبِ اولیاء قدس سرہٗ کا سنہ ولادت باختلاف روایات ۶۳۳ھ یا ۶۳۴ھ ہے اس طرح وہ امیر سے سولہ سترہ برس بڑے تھے ترجیع منقبت کے ایک شعر میں اپنا تخلص سلطانی کے بجائے خسرو اختیار کرنے کی اجازت طلب کی ہے اور یقین ہے کہ مرشد کا شرف قبول حاصل ہونے کے بعد یہ تخلص خلعتِ دوام سے سرفراز ہوا

یا بر از خاک درت تاج قبول ار بر سر

خسرے گردد بر ملکِ سخن سلطانی

چونکہ منقبتِ شیخ میں صرف یہی ترجیع اور ایک دو رباعی اور قطعہ اس دیوان میں پائے جاتے ہیں اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ امیر کا تعلق شیخ سے غالباً ۶۶۹ھ کے قریب ہوا مدح شیخ میں جو رباعی لکھی ہے اُس کے ایک ایک حرف سے اُس عقیدت اور خلوص کا اظہار ہوتا ہے جو تقریباً ساٹھ برس تک امیر کو اپنے ہادی طریقت کے ساتھ رہا اور جو فنا فی الشیخ کی حد تک پہنچ گیا تھا۔

رباعی

گر پاک شود دیدۂ من زآلائش

اندر تہ پائے شیخ سازم جائش

حاجت نبود کہ دیدہ را پاک کنم

خود پاک شوم چہ مالم اندر پائش — تحفۃ الصغر

اس زمانے میں دیباچہ کو چھوڑ کر خود امیر کے اس زمانے کے ذاتی حالات پر سب سے زیادہ روشنی تحفہ کی مثنوی ڈالتی ہے جو اُنکی جدتِ طبع کا نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ یہ مثنوی جس میں تقریباً دو سو شعر ہیں اُس زمانے کی ہے جب تخلص سلطانی تھا اور کلام کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سولھویں سترھویں برس میں لکھی گئی تھی اس مثنوی کے واقعات پر غور کرنے سے مجھے معاً یہ گمان ہوا تھا کہ اس میں پٹیالی کے جو امیر کا مولد ہے حالات لکھے ہیں لیکن بظاہر تمام مثنوی میں پٹیالی کا لفظ کہیں موجود نہ تھا ایک مدت کے بعد جب میں یہ شعر پڑھ رہا تھا ؎

گرنہ ایں از قضائے یزدانیست

ببتیالی چہ جائے سلطانی است

جائے من بود قبلۃ الاسلیم

قبلۂ خسروانِ ہفت اقلیم

معاً یہ گمان ہوا جو بعد میں یقین سے مبدل ہو گیا کہ شعر ثانی کے مصرعۂ اولیٰ میں قبلۃ الاسلام درحقیقت قبۃ الاسلام ہے جس سے امیر اور اُن کے معاصرین مصنفین کی مراد دہلی ہے جو اس زمانہ میں اس لقب سے موسوم تھی اور پہلے شعر میں ناواقف کاتب نے بتیالی (یعنی پٹیالی کو بتیالی سمجھا ہے اور دونوں لفظوں کے رسم الخط میں اس قدر مشابہت قریبہ پائی جاتی ہے کہ اس غلطی کا کوئی بڑا الزام بیچارے کاتبوں پر عائد کرنے کا موقع نہیں ہے۔

مثنوی کے مضامین کا خلاصہ یہ ہے کہ امیر جور فلک کا شکوہ کرتے ہیں کہ پورے ایک برس سے دہلی چھوڑ کر پٹیالی پڑے ہوئے ہیں یہ ایک مستحکم قلعہ ہے جہاں جاہل و رنگ جو افغانوں کا دخل ہے افغانوں کو چھوڑ کر باقی سب مفلوک الحال سپاہی بستے

---

۱ اسی طرح ایک قصیدے میں جو اغلباً بلبن کی مدح میں ہے فخر کرتے ہوئے اپنے دونوں تخلصوں کو جمع کیا ہے ایک شعر میں ہے ؎ خہ کہ در عہد تو سلطان سخن خسرو لاچین سلطانی شدہ است ایک دوسری جگہ کہتے ہیں ؎ از حد گذشت خسرو سلطانی این بساط ۔ یہ اور اسی قسم کا باقی کلام اس زمانے کا ہے جب جدید تخلص اختیار کیا تھا لیکن ابتدائی تخلص بھی پورے طور پر ترک نہ ہوا تھا یہ کلام سلطانی اور خسروی سلسلے کی بیچ کی کڑی ہے ۲ ضیاء برنی نے لکھا ہے کہ سلطان بلبن نے دوآب پر تسلط حاصل کرنے کے بعد حفاظت اور قیام امن کیلئے پٹیالی میں حصار تعمیر کیا تھا اور اس میں افغانوں کو بسایا تھا (فیروز شاہی)

ہیں جو سپہ سالار کی آمد پر طرح طرح سے اپنی ناداری کا دکھڑا روتے اور افغانوں کے مظالم کی شکایت کرتے ہیں۔ امیر خسرو خود بھی زمرۂ سواران میں شامل ہیں اور تنخواہ اور مدد معاش کا جو غلہ آتا ہے وہ ان تک پورا نہیں پہنچتا افغان بیچ میں خورد برد کر جاتے ہیں رات کو پہرہ پر جانا پڑتا ہے۔ مچھر الگ ستاتے ہیں تو مچھر ستاتے ہیں انہیں اس جگہ سے دلی نفرت ہے اور وحشت ہوتی ہے دار السلطنت کے دل فریب مناظر اور اہل علم و ہنر کی صحبتیں یاد آتی اور رہ رہ کر دل مسوستی ہیں:-

منکہ مسلم بہ صحبت ظرفاست | باچنیں قوم زشت بایدخاست
طوطیٔ کز سخن شکر باشد | با کلاغان و سار چوں باشد
من دریں حصن برکشیدہ بماہ | سالے و رزیم امروز تباہ
کہ اگر ذرۂ نہند بہ کوہ | کوہ آید زبار آں بہ ستوہ

(مثنوی تحفہ)

پٹیالی میں صرف دو شخص ان کے ہمدم ہیں ایک ابو المحامد علاؤ الدین محمد محمود اور دوسرے ختیار لشکرہ داران رفقا کے ساتھ دل بہلانے کے لئے کبھی گنگا کی طرف یا صحرا کی جانب نکل جاتے ہیں اور اشعار خوانی سے غم غلط کرتے ہیں ایک پیدائشی شاعر کے لئے ایک ایسے مقام پر جہاں عراقی دلچسپیاں مفقود تھیں قدرت کے دلکش مناظر ذوق و تسکین کا ...

گرنہ اندیشۂ سینہ را نہ نہیم | بنگلے یا ترانہ گوئیم
کہ خرامیم جانب صحرا | کہ بر و سبزہا ز دل سودا
گاہ گر دیم سوے گنگ چاں | کہ غم از دل بشوید آب رواں
ہمچناں می بریم در تب و تاب | عمر خود در کرانہ بر لب آب

(مثنوی تحفہ)

اسی دوران میں باران بہار شروع ہو جاتا ہے امیر اسے فال نیک سمجھ کر بیداری بختی کی تعبیر دیتے ہیں اور اپنے ممدوح اختیار الدین[1] کی خدمت میں سرگذشت بامید داد رسی بھیجتے ہیں۔ یہ مثنوی اس زمانے کی ہے جب تک انھوں نے خسرو تخاص اختیار نہیں کیا تھا یعنی عماد الملک کا ابھی تک انتقال نہیں ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس مثنوی میں امیر نے شاعرانہ ستم ظریفی سے کام لیا ہے اور بعض حالات کے بیان میں ظریفانہ مبالغہ کیا ہے ورنہ ہم کو تعجب ہوتا ہے کہ اتنی جس تہی دستی اور بیچارگی پر اس طرح اشکباری کی ہے

من کہ از زمرۂ سوارانم | از تہی دستی اشک بارانم
خدمت عت درمیاں نانے | کندہ باید بدیں صفت جانے

وہ امیر کو عماد الملک کے حین حیات میں کیونکر پیش آئے۔ ہمیں تو صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ اپنی مرضی کے خلاف انہیں ایک برس تک پٹیالی میں رہنا پڑا تھا اور چونکہ طبیعت دار السلطنۃ کی دلچسپیوں کی عادی ہو چکی تھی اس کورہ میں انہیں ایک ایک گھڑی پہاڑ تھی۔ اس شیوۂ بیانی کا ماحصل صرف اسی قدر ہے کہ ماموں جان ہمیں دہلی بلا لیجئے پٹیالے میں جی نہیں لگتا۔

حقیقت یہ ہے کہ خاندانی اور ذاتی تعلقات کی وجہ سے امیر کا اکثر زمانۂ حیات دہلی میں گزرا اور شروع ہی سے دہلی ان کیلئے بمنزلہ وطن کے ہو گئی تھی۔

عہ قدرتی مناظر امیر کے دل پر بہت گہرا اثر کرتے تھے مناظر کی تصویر انھوں نے بہت جگہ کھینچی ہے اور اس طرح کھینچی ہے کہ پڑھنے والا دیکھتا رہ جاتا ہے اس مثنوی میں جہاں برسات کا سماں باندھا ہے بہت ظاہر ہوتا ہے کہ جزئیات فطرت کے مطالعہ کو اور اس کی مصوری کا ملکہ ابتدا ہی سے ان پر کس قدر موجود تھا۔ عہ اختیار الدین امیر کے ایک ماموں کا نام تھا جو فوج میں ایک معزز عہدے پر (بقیہ صفحہ آئندہ)

اس مثنوی میں باوجود اس کم سنی کے امیر نے بیان واقعات فطرت نگاری شوخی و جدت کا بہت بڑا کمال دکھایا ہے افغانوں اور قلعہ کی ہجو بڑے جوش کے ساتھ کی ہے سپاہیوں کی تباہ حالت کا نقشہ اور ان کی زبانی ان کی بدحالی کا شکوہ سپہ سالار کے روبرو ، شہر و دارالسلطنت کے مناظر کا بیان اور باران بہار کی کیفیت بہت دل پسند پیرایہ میں لکھی ہے ۔

جس زمانہ میں امیر نے یہ مثنوی لکھی ہے دہلی کو فتح کئے ہوئے مسلمانوں کو کوئی اسی برس گزر چکے تھے ۔ ایبک اور التمش کے زمانے میں مسجد قوۃ الاسلام اور قطب مینار تعمیر ہو چکے تھے ۔ حوض سلطانی بھی التمش کی یادگار تھا ۔ مینارے اور حوض کا ذکر مثنوی میں اس طرح کیا ہے :-

بحر صد چشم در نظارۂ او | مہر منجوقی از منارۂ او
کاہش در بلند پروازی | گرد با زلف مہ رسن سازی
حوض سلطان ز روشنائی و رنگ | سیم محلول ریختست بسنگ

(مثنوی تحفہ)

ایک قصیدے میں جس میں بلبن کی صحت یابی کی مبارک باد ہے اور جشن عام کا بیان لکھا ہے "کوشک لعل" کا ذکر بھی کیا ہے ؎

ز کوشک لعل چو بنمود روئے را بنمود
شہ سپہر ز میدان سبز رش استقبال

خاندان غلامان کے ترک سلاطین کا مستقر یہی قصر تھا جو حصار پتھورا کے اندر دارالسلطنت کے کسی مناسب موقع پر بنا ہوا تھا بلبن کے رنگیلے جانشین کیقباد (۶۸۶ھ تا ۶۸۹ھ) نے جو سلسلہ غلامان کا آخری تاجدار تھا ۔ قدیم دارالسلطنت کے محل وقوع سے ہٹ کر کوئی چھ سوا چھ میل شمال مشرق کی جانب قصر کیلوکھری تعمیر کیا اس کے بعد تو پھر گویا ایک رسم قرار پا گئی کہ جو نیا بادشاہ ہوا اور وقت نے مساعدت کی ہر ایک نے قدیم مرکز حکومت کے قریب نیا کوشک بنوایا اور نیا دارالسلطنت قائم کیا ۔ جلال الدین خلجی نے حصار کیلوکھری کی تکمیل کی علاؤالدین اور قطب الدین نے سیری میں دارالخلافہ تعمیر کیا ۔ غیاث الدین تغلق نے تغلق آباد بنوایا غرض امیر کے سامنے پچاس برس کے اندر دہلی کا پھیلاؤ کہیں سے کہیں پہنچا ۔ اللہ اللہ آج کھنڈروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا نہ کوشک لعل کا نام و نشان باقی رہا نہ طبل شاہی کی آواز ہے ؎

ز طبل شاہی آوازہا کہ برخاست | بشرق و غرب ہمی رفت و جنوب و شمال

(تحفہ)

بقیہ صفحہ سابقہ :- سرفرازتھے وسط الحیات کے ایک قصیدے میں ان کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎ نخست خال بزرگ اختیار دین کہ بنام محمد است کز نام محمدت واللہ ابتدا میں مجھے اس نام کے متعلق غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی اور میرا یہ خیال تھا کہ اس نام سے اختیار الدین کشلی خاں عرف ملک چھجو مراد ہے جو سلطان بلبن کا بھتیجا تھا جس کی ملازمت امیر نے نانا کے انتقال کے بعد اختیار کر لی تھی ۔ امیر کے ماموں اور ملک چھجو کے علاوہ امیر کے ایک دوسرے مربی علی بن ایبک (حاتم خاں) کا لقب بھی اختیار الدین تھا امیر کی تصانیف میں اسما اور القاب کی تطبیق میں نہایت احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے ایک ہی لقب سے مختلف زمانوں میں مختلف ممدوح موسوم پائے جاتے ہیں اس لئے امیر کے حالات اور ہر عہد کی تاریخ پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ تطبیق میں مغالطہ نہ ہو ۔ تحفہ کے زمانۂ تصنیف سے کوئی پندرہ سولہ برس بعد علی ایبک سے تعلقات پیدا ہوئے علاوہ ازیں اکثر جہاں اختیار الدین سے مراد کشلی خاں یا حاتم خاں ہیں وہاں امیر نے ان کا نام بھی لکھا ہے ۔

عروس البلاد کے جشن و نشاط عام کی ایک کہانی رہ گئی ہے ؎

بروز جمعہ بیارا ستند ہمچو عروس

بلائے شاہِ جہاں شہر را بزیور دل (تحفہ)

یہ امر نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اس عہد میں جسے مورخین جاہل غلطی سے عہد افغانیہ یا پٹھانوں کا زمانہ کہتے ہیں سلطنت پر ترکوں کا تسلط تھا اور عنانِ حکومت تمام تر سلاطین و اُمرائے ترک کے ہاتھ میں تھی امیر نے افغانوں کا اور بھی کئی کتابوں میں ذکر کیا ہے لیکن اس طرح جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس عہد میں ان کی حیثیت میں کسی قسم کا سیاسی امتیاز یا تفوق پیدا نہ ہوا تھا۔ جہاں فوج میں سلطنت کی مختلف نسلوں اور متفرق ملکوں کے سپاہی نوکر تھے وہاں افغان بھی تھے اور بلاشبہ اپنی شہر لیتی اور جنگجوئی کی وجہ سے اچھے سپاہی سمجھے جاتے تھے تاریخ کا یہ عہد خالص ترکوں کی حکمرانی کا عہد ہے اور اس سے بڑھکر کوئی غلطی نہیں ہو سکتی کہ اُسے افغانوں کا زمانہ کہا جائے جن کا تاج و تخت میں کوئی حصہ تھا نہ خاص سیاسی اہمیت حاصل تھی:۔

اس مقدمہ کے ختم کرنے سے پہلے تحفہ کی ایک نمایاں خصوصیت پر نظر ڈال لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ تمام اساتذہ نے خسرو کو صنائع اور بدائع کا بادشاہ لکھا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ لفظی و معنوی صنعتوں سے اُن کی طبیعت کو خاص لگاؤ تھا ذہنی ترقی کے بعد اُنہیں معلوم ہو گیا تھا کہ اچھی شاعری کا بڑا حسن سادگی اور جذبات میں ہے اور یہ سب تکلفات لاحاصل ہیں۔ اسی وجہ سے جوں جوں عمر ترقی کرتی گئی اُن کا کلام بتدریج اس قسم کے خس و خاشاک سے پاک ہوتا گیا۔ بعد میں صنائع بدائع کا تمام التزام امیر نے نثر کے لئے مخصوص کر دیا تھا اور سارے تکلفات اس کی آرائش میں صرف کرتے تھے تحفہ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہو گا کہ اگر مذاقِ سلیم رہبری نہ کرتا تو امیر کی شاعری کے لئے یہ بڑا خطرہ تھا سارا دیوان صنعتوں سے بھرا پڑا ہے اور کہیں تو اس قدر بھرمار ہے کہ بعد میں وہ خود جب ان چیزوں کو دیکھتے تھے تو ہنستے تھے اور بچپن کی خام طبعی کہکر معذرت کر دیتے تھے۔

ایک قصیدہ ۲۷ اشعار کا شہابِ مہمرہ کے اتباع میں لکھا ہے اور ہر بیت میں مور و مو کا التزام ہے ؎

شہابِ مہمرہ در مور گفتہ است خوب تر شعرے
؛ دل چوں مور من نیز از قضا سفت آں گہر موے
چو من مورے کجا موے بجاکِ پائے او مانند؛
؛ چہ مرد اِن اسد بازے چہ ہم سنگ گہر موے
ولیک از راہِ گستاخی بہ مور و موے آورد م؛
؛ ہزار از مور طبعم تیز زیں ساں پر در موے

ایک قصیدے میں ردیف و موے آہ و مہر اور شانہ و آئینہ کا التزام ہے بڑی ہوشیاری سے خیال کی ہیں ہر شعر میں یہ چاروں لفظ نبھائے ہیں۔ تقریباً چالیس شعر لکھکر ختم کیا ہے تشبیب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اے ماہ بستہ روے تو مہر اندر آئینہ
موے ز شانہ ریختہ عنبر بر آئینہ

؎ امیر خسرو سے پہلے ساتویں صدی ہجری کے نصف اول میں شہاب مہمرہ بدایونی مشہور شاعر تھے امیر نے ایک جگہ شہاب مہمرہ کا مطلع ذکر کیا ہے۔ وہ بداؤں بھو مسرت بر خیز و ز خواب نگر [illegible] شیخ عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں شہاب مہمرہ کو رکن الدین سلطان [illegible] کے عہد کے مشہور شاعر [illegible] ... کا التزام ہے قصیدہ [illegible] ... (... مطبوعہ کلکتہ)

بفشاند مشکِ موئے تو از شانہ گرد ماہ ؛
؛ بنمود عکس روئے تو مہرِ اندر آئینہ
(گریز)
از بہرِ موئے و روئے تو اے شاہِ مہرباں ؛
؛ گرد ز دستِ شانہ و از خنجر آئینہ
آں شاہِ مہر تیغ علاء دول کہ ہست ؛
؛ در موش ماہ شانہ بروش اختر آئینہ
موئے اگر ز شانہ دہد ماہ را بہ مہر ؛
؛ مہ را کشد چو روئے وے اندر بر آئینہ

اپنی موشگافی کا ذکر:-

خسرو ز روئے موئے شگافی چو شانہ گشت
در مدحت از مہر مہت در خور آئینہ
(دعا)
میخور بجام مہر و مہ از ساقی کہ کرد
موئیش چو روئے شانہ پر از عنبر آئینہ
چوں موبچنگ شانہ اسیر تو مہر و ماہ
واز روئے تو بدہر ضیا گستر آئینہ
از دست بخت شانہ دولت بروئے تو ؛
واز مہر و مہ بروئے تو تا محشر آئینہ

اس کے علاوہ کسی قصیدے کے قافیہ میں ناخن کا کسی میں انگشت کا کسی میں کمر کا کسی میں آئینہ کا التزام کیا ہے ایک قصیدے کی تشبیب میں معشوق کا سارا سراپا صنعت کے قلم سے کھینچا ہے۔ مطلع ہے۔

فرقِ تو از طریقِ فسوں سازی اے نگار
آوردہ راہ مور پدید از دہانِ مار

حق یہ ہے کہ خوب اشعار نکالے ہیں۔ ابرو کا ذکر دیکھئے۔

ابروئے تو کہ سخت بلند است چوں کماں
پیوستہ تا بگوش بکش بہر کارزار
جفت ابروئے ترا نہ سزد عقدہ درمیاں
بے عقد اگرچہ جفت ندیدیم ساز دار
در چشم جادوئے تو ز اعجاز جادوئے
با روزِ تیرہ گشتہ شب روشن است یار
در دو ستارۂ تو بہ ہر ار نظر کنم
یک تیر غمزۂ تو دو چشم کند چہار

بیتالیس شعر میں سراپا لکھا ہے اور گریز کے صرف دو تین شعر میں مدح ختم کر دی ہے پھر مطلع ثانی لکھکر تشبیب بہار شروع کی ہے اور پینتیس شعر بہار کے لکھکر صرف تین شعر میں گریز و مدح ہے جزو ثانی میں سلطانی او جزو اول میں خسرو تخلص ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں در اصل ایک وقت نہیں لکھے گئے بہار کے بیان میں وہی فطرت نگاری اور حقیقت طرازی ہے جس کی ایک پیدائشی شاعر سے توقع کی جاتی ہے

ابر از برائے تہنیت گلشن ربیع ؛
؛ کرد آستینِ سبزہ پر از دُر شاہوار
بہمن بر آنکہ زد و زند تیر بر خزاں ؛
؛ از شاخ سرو یافت کماں چوں سفندیار
بید است بر کشادہ سناں بر سپاہ دے ؛
؛ باد است باز دادہ عناں را برا ہوار
پیکانِ غنچہ گشتہ ز سوہانِ باد تیز ؛
؛ گلہا سپر کشیدہ بسر بہر کارزار
داد آسماں زمینِ چمن را نقابے نو ؛
؛ زد گلستاں نشانہ وے را خدنگ خار

صد نقش بست باد شمالی بروئے آب ؛
صد رنگ ریخت رنگ ریاحین بروئے با[غ] ؛
چوں باد بر سر آمد سلطانِ غنچہ را ؛
از تنگ خار جامہ تنگ کردہ پارہ پارہ

پھولوں کی بہار دیکھئے ھ

گلہائے کوزہ برصفتِ کاسہائے سیم
پُر کرد خوانِ زر زرِ خالص کناں نثار
از کاس لالہ خورد مگر برگ کوزہ مئے ؛
کافتد بہر طرف چو حریفاں بادہ خوار
از بس کہ خونِ لالہ بہ گردن گرفت کوہ
بالش بہ گل بماند سرش گشتہ سنگ سار
صد برگ برکشاد درِ ناز بر قفاش ؛
بیروں کشید خنجر بیداست روزگار
داند بنفشہ کو تہی عمر گل از انکہ ؛
خم قامت و کبود لباس ست سوگوار
مولیست سر بسر تنِ سنبل وزین قبل ؛
موئے نمی برد ز سر زلف غم گسار
گنج زر است در دہنِ نرگس خراب
شک نیست گنج را بہ خرابی بود مدار
صد برگ راز پردۂ عظمت بروں فگند
سوری چو دور کرد ز بالائے سر خمار
بالش گرفت خسرو گل بر سریر شاخ
پس از دہاں بجنع بروں ریخت برکنار
یک پا ستادہ گرد سرش چوں سلامیاں
سر ہر کماں کشیدہ او شد سناں گزار
گسترد باد فرش ریاحین بروئے خاک
افگند باغ نطع بساتین شاخسار
بلبل کہ ہست حاجبِ خاص از ادائے فضل
جاں از شگوفہ بردہ دل خستہ از شمار
مرغانِ باغ را پس ازیں درس تو دھد
سلطانی از ثنائے سلیمان روزگار

سبحان اللہ اس تشبیب کو دیکھئے اور ذرا شاعر کی صغر سنی کا خیال کیجئے سچی شاعری کے یہی جوہر تھے جو خسرو کے ہاں ابتدا ہی سے نمایاں تھے اور جن کے مقابلہ میں تصنعات کو زیادہ فروغ پانے کا موقع نہ ملا اگر خدانخواستہ طبیعت بالکل ادھر کی ہو کر رہ جاتی تو کیا حال ہوتا؟ خسرو سے بڑھکر کسی کے لئے یہ خطرہ نہ تھا اسی زمانہ میں جہاں ان کی سچی شاعری کے نمونے بھی کافی موجود ہیں محض لفظی تصنعات کی طرف نسبتاً زیادہ التفات معلوم ہوتا ہے۔ ایک قصیدہ ہے جس میں لفظی الٹ پھیر ہی میں تیس شعر لکھ ڈالے ہیں۔

مشتے نمونہ از خروارے

چند اشعار ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے نقل کئے جاتے ہیں ھ

بر عارضِ خوبت چہ کنم عرض عریضہ
از چشمہ ہر چشم چشمۂ دیگر
مشہور بہ شہرم ز تو اے شہرۂ صد شہر
ہمچوں کرم از مکرمتِ مکرم کشور
محمود محمد فرو در خورد محامد ؛
پور عرض عمر عرض را شدہ جوہر

از کاہشِ تنگ کاہ شود بیشِ شکوہش   فرقد تو فرق شدہ برسر فرقد
مقرونِ بوقار ار شود آں ذات موقر   شعرم ز شعارش شدہ از شعریٰ برتر

سید حسن برنی

تجرید

ہر دل کہ درو مایۂ تجرید کم است   بیچارہ ہمہ عمر ندیم ندم است
جز خاطر فارغ کہ نشاطے دارد   باقی ہمہ ہر چہ ہست اسباب غم است   (عمر خیام)

اکثر الفاظ بعض دفعہ غلطیوں کا باعث ہو جاتے ہیں بعض لوگ محض الفاظ پرستی کی دھن میں پھنس کر ان امور کے قائل ہو جاتے ہیں جو نہ صرف اخلاق ہی کے منافی ہوتے ہیں بلکہ خود انسانی فطرت کے بھی خلاف ہوتے ہیں لفظ تجرید بھی بعض کے واسطے بعض دفعہ چند در چند غلطیوں کا باعث ہو جاتا ہے جب تجرید سے مراد ناکتخدائی لی جاتی ہے تو یہ غلطی تمدنی رنگ میں بہت کچھ نقصان کا موجب ثابت ہوتی ہے بعض لوگوں کا یہ مقولہ ہے کہ مجرد رہنا زندگی کی خوش اسلوبی گزارنے کے واسطے ایک اچھا ذریعہ ہے ممکن ہے کہ اس میں کچھ سچائی بھی ہو لیکن تمدنی ضروریات کے واسطے یہ روش ایک ایسا غلط راستہ ہے کہ جس کی غلطی سے کبھی انکار کیا ہی نہیں جا سکتا تمدن کی سب سے بڑی کڑی مناکحت اور شادی ہی ہے یا یوں کہئے کہ تمدن اسی رشتہ سے شروع ہوتا ہے یا اس پر اس کا بہت کچھ مدار ہے جب انسان متمدن الطبع ہے تو وہ کس طرح تجرید پر فتویٰ دے سکتا ہے اور کس طرح تجریدی رنگ قبول کر سکتا ہے اگر ایک طرف وہ اپنی فطرت میں تمدنی مواد پاتا ہے اور دوسری طرف عمل میں پیچھے رہتا ہے تو گویا وہ خودکشی کرتا ہے فرض کرو کہ تجرید ایک اچھا مسلک ہے سب لوگ مجرد ہوں تو یہ دنیا کس رنگ میں ہو جائے۔

یہ کہنا کہ تجرید میں انسان خوش اور آزاد رہتا ہے ایک سخت غلطی ہے ہمیشہ انسان باوجود دعوئے آزادی کے جب تک کوئی پابندی اپنے آپ پر عاید نہیں کرتا تب تک وہ خوش رہ . . . ہی نہیں سکتا کھانے پینے میں دیکھو کس قدر پابندیاں ہیں چلنے پھرنے میں کس قدر پابندیاں ہیں اگر یہ پابندیاں نہ ہوں تو زندگی انسان کی ایک تہلکہ میں پڑ جاوے عورت اور مرد کا رشتہ خود انسان نے نہیں بنایا قدرت نے بنایا ہے اور خواہ کوئی کتنا ہی توڑے ٹوٹ نہیں سکتا یہ دونوں کڑیاں انسانی زندگی کا شروع

اور خاتمہ ہیں اگر ایک کڑی ٹوٹ جائے یا الگ کرلی جائے
تو گویا ساری زنجیر بھی ٹوٹ گئی۔

بعض لوگ کہتے ہیں علایق دنیا سے قطع تعلق ایک تجرید ہے
اور اس تجرید سے انسان کی قوتیں تزکیہ پاتی ہیں یہ کسی قدر
درست ہے کہ علایق سے وابستگی بعض دفعہ بہت کچھ
تکلیف کا باعث ہوتی ہے لیکن کون کون سے علاقے
توڑدینگے سب سے زیادہ علاقہ اور وابستگی تو اس دنیا میں
رہنے کی ہے اور پھر اکل وشرب کی یہ تو کسی حالت میں بھی
دور نہیں ہوسکتی اگر کوئی شخص بعض ضروریات کے باعث
قطع علائق کرتا ہے تو شاید اُس کی دلیل کوئی جان رکھتی ہو
اور ایسی مثالیں مستثنیات میں داخل کی جانی چاہئیں
لیکن ایک کلیہ کے طور پر تجرید کی مدح سرائی تمدن کی مذمت ہے
بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ:۔

اگر عورت و مرد کا میل جول تحت اغراض شہوانی کے ہے تو
یہ بات بلاتعلق عورت و مرد کے عارضی طور پر بھی حاصل
ہوسکتی ہے ملک فرانس میں اس قسم کی تھیوریاں نکلا کرتی تھیں
لیکن موجودہ جنگ نے ثابت کردیا ہے کہ جن لوگوں نے یہ
تھیوری قائم کی تھی وہ ملک وقوم کی سرسبزی کے سخت
دشمن تھے اگر بعض صوفیوں نے تجرید پر زور دیا ہے اور وہ بھی
دو چار تو اُن کے دلائل ہی کچھ اور ہیں اُن کی
غرض صرف تزکیہ ہے اور ان لوگوں کی غرض بے لگامی
اور خود داری ہے۔

یہ کہنا کہ کھلے تعلقات میں اچھائی اور فائدہ ہے ایک سخت
مغالطہ ہے انسان جب کسی معاملہ میں کھلا رہ کر فائدہ نہیں اُٹھا سکتا
تو اس صیغہ میں کیونکر فائدہ اٹھا سکتا ہے ہرجائی ہونا بعض
حالات میں اگر اچھا ہے تو اس صیغہ میں تو سخت معیوب ہے
اور دل کی تسکین تو کسی صورت میں بھی میسر نہیں ہوسکتی
کیونکہ دونوں طرف آزادی ہونے کی وجہ سے وہ محبت
اور خلوص نہیں ہوتا جس کی ضرورت ہے دونوں
حد سے زیادہ چوکنے ہوتے ہیں اور موقع کے منتظر نکاح ایک معاہدہ ہے
دنیا میں کوئی کام سوائے معاہدہ کے نہیں ہوتا اس طرح
یہ معاہدہ قائم رہنا ضروری ہے یہ کہنا کہ عدم پابندی
کی صورت میں بھی ایک معاہدہ بھی ہوتا ہے یہ درست
نہیں یہ معاہدہ ہوتا ہی نہیں بلکہ ایک قسم کی خوش باشی
ہوتی ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا لوگ سمجھتے ہیں کہ
شادی کی ضرورت جوانی میں ہی ہوتی ہے یا صرف اولاد
ہی نصب العین ہے شادی کی غرضیں اور بھی ہیں وہ
کیا کیا:۔

طمانیت قلب ۔ ضرورت تمدن ۔ رفاقت ۔
خانہ آبادی ۔ نظم ضروریات ۔

یہ وہ ضرورتیں ہیں جو ہر شخص کو اپنی زندگی میں پڑتی ہیں
اور جس سے کسی کو گریز نہیں اور نہ کوئی اُن سے انکار
کرسکتا ہے سب سے زیادہ ضرورت عورت کی اولاد
ہونے کی صورت میں ہی ہے اور خانہ آبادی کے واسطے
بھی لیکن زیادہ تر ضرورت بڑھاپے میں ہی ہوتی ہے
جب بال بچے بھی پرورش پاکر ادھر اُدھر ہو جاتے ہیں
قوا جواب دیجاتے ہیں احباب کی رفاقتیں چھوٹ
جاتی ہیں خیالات کا ایک اور رنگ یا یوں سا نہ پہلو ہی متوجہ
ہونے لگتا ہے پرانی صحبتوں کی ضرورت ہوتی ہے با ایں
حالات ایک بلاتکلف رفیق اور محرم راز کی ضرورت ہوتی ہے

یہ تکلیف پوچھو اُن لوگوں سے جن کی بیویاں یا رفیق پیری کے
زمانہ میں جدا ہو گئے ہیں بال بچوں کی نظریں ہی پھر جاتی ہیں
کچھ دنوں کے بعد پھبتیاں کرنے لگتی ہیں اور لڑکے پوتے
ایک عضو زائد سمجھکر دن بدن تفرد ہوتے جاتے ہیں ادھر یہ
مصیبت کہ پیرانہ سالی کچھ کرنے نہیں دیتی جرأت
جواب دے چکتی ہے ادھر خدائی فوجدار جن سے دنیا خالی نہیں
یہ کہنے لگ جاتے ہیں اب تو حضرت کسی مسجد یا کسی مندر میں بیٹھنا
چاہئے یہ کوئی وقت ہے کہ خود بدولت بال بچوں اور بہوؤں
میں سارا دن (کھوں کھوں) کرتے رہتے ہیں یعنی کھانستے رہتے
ہیں ۔

دیکھو بڑھاپے میں بیوی کی کس قدر ضرورت ہے ایک معتدر
آدمی نے کہا کہ اگر میں کبھی وصیت کروں گا تو یہ بھی اس میں
لکھوں گا کہ اگر کوئی ۸۰ سال میں بھی زندہ ہو جاوے تو بھی
بیوہ مناسب عمر سے شادی ضرور کر لے کسی ہمراز نے پوچھا
یہ کیوں قبر میں پاؤں اور شادی جواب دیتے ہیں کہ میری
مراد کسی کنواری اور نوجوان عورت سے شادی کی نہیں ہے
بلکہ اپنے سے کوئی پانچ دس سال کم عمر کے ساتھ تم دیکھتے نہیں ہو
کہ میری ساری عمر کمائی میں گزر گئی ہزاروں روپیہ جوں توں
کرکے کمائے اور اپنی جان پر مصیبتیں لیں اور بیوی کے مرنے
روٹی یوں ملتی ہے جیسے نامرغوب نوکر نا مطیع عمر خاندان کو
ہر شخص دیکھتا ہے کہ کب گلے سے اترتے ہیں۔ اس قسم کے
واقعات بیشک دنیا میں گزرتے ہیں اور اپنی ضرورتیں بعض کو
ایک مزید تکلیف میں ڈالتی ہیں اگرچہ ایسے لوگوں کی کہانیاں
عام طور پر قطعی حکم نہیں رکھتی ہیں مگر پھر بھی ان میں کچھ
اصلیت تو ہے ۔

ایک دفعہ ایک ڈاکٹر یوروپین سے پوچھا کہ آپ جو پنشن
لیکر جاتے ہیں ولایت جاکر کیا کرتے ہیں فرمایا کہ ایک سال تو
سیر سیاحت میں گزاروں گا اور بعدازاں شادی کروں گا ۔
تعجب سے پوچھا کہ اس عمر میں ۔
فرماتے ہیں میں شادی بصرف رفاقت کی خاطر کرتا ہوں
ایسی رفاقت جس کی وسعت مجھ سے زیادہ تر وابستہ ہو
یا وابستہ رہنے کا خیال کیا جا سکے چونکہ ولایت میں تھوڑے
دن کے رفاقت بڑی مہنگی ملتی ہے اس واسطے بھی اکھے
میں نے کہا کہ آپ کی عمر زیادہ ہے بیوی کس عمر کی ہوگی ۔
فرمایا کہ کوئی ۲۸ ۔ ۳۰ ۔ ۳۵ سال کی ہو تو بہتر ہوگا ۔
پھر میں نے پوچھا کہ موت آپ پر جلد تر ہاتھ صاف کرے گی
کہا کہ میں ڈاکٹر ہوں بہ نسبت تمہارے اس بارہ میں ایک اچھا جواب
دیکھتا ہوں مرنا جینا قدرت کے ہاتھ میں ہے کم عمر پہلے مر جاتے
ہیں اور بڑی عمر والے باقی رہتے ہیں بہ نسبت بوڑھوں کے
بیوگان کے جوانوں کی بیوگان عموماً زیادہ ہیں ۔
پھر میں نے کہا کہ اس قسم کی رفاقت کی ضرورت کیا ہے ۔
فرمایا کہ شاید تم کو نہ ہو مجھے تو ہے میں اپنا جواب وہ خود
ہوں فرمایا کہ دنیا میں کئی ایک قسم کی جنگیں ہوتی ہیں یہ بھی ایک
قسم کی جنگ ہے جب اور جنگوں کے کشتوں پر معمولی افسوس کے
سوائے اور کچھ نہیں کیا جاتا تو اس میں بھی وہی صورت ہے
میں نے پھر پوچھا فرض کریں کہ آپ گزر گئے اور آپ کی بیوی
زندہ رہی پھر اس کی حالت ۔
کہا کہ جو نوجوان کی بیوگان کی ہوتی ہے ۔
میں نے کہا کہ آپ کے دل و دماغ پر اس صورت میں کیا
گزرے گی ۔

کہا کہ جو نوجوانوں کے دلوں پر گزرتی ہے بلکہ اُس سے بہت ہی کم کیونکہ انہیں ابھی بہت کچھ امید ہے اور ہم امید ٹوٹنے کے بعد اس تجربہ گاہ میں یا اس دور میں آئے تھے ۔

جب میں چلنے لگا تو ہنسکر کہا کہ

اگر میں ولایت میں ہوتا تو اس کے متعلق مجھ پر اس قدر سوالات نہ ہوتے اور نہ ایسی نکتہ چینی کی ضرورت میں کیونکہ لوگوں کو وہاں اسقدر فرصت نہیں ہوتی اور دوسرے یہ کہ اگر میں ولایت جا کر شادی کروں گا بھی تو اُس کی خوبی اور نقصان کے ہم دونوں میاں بیوی ذمہ دار ہوں گے ۔

میں نے کہا کہ ولایت کی شادیوں میں بھی اس قسم کے قصے کہانیاں چلتی رہتی ہیں اور وہ بھی ایک نکتہ چینی ہی ہوتی ہے کہا کہ شاید ہوتی ہو مگر باوجود اس کے بھی لوگ باز نہیں آتے اگر مجھے ایک شئی یا ایک محل میرا اپنی دانست میں آرام نظر آتا ہے تو میں آپ سے تمھاری خاطر یا تمھاری نکتہ چینی کی خاطر چھوڑ نہیں سکتا ۔

مگر بابی ۔

میرا خشاء ان دو تین مثالوں کے ذکر کرنے سے یہ ہے کہ انسان بجز بعض شخصیات کے ہمیشہ جوڑے کی تلاش میں رہتا ہے اور اس کے سوائے اُس کی گزران نہیں اس واسطے شروع ہی سے تجرد پر زور دینا ایک ایسی راہ ہے جو تمدنی تماشے کو بالکل بے رونق بنا دیتی ہے اور ہمیں اس زندگی میں بہر صورت تمدنی تماشے کی ضرورت ہے ؏

با یہ برائے مجلس نسود اِیہا تہ

واقف زیار وعدہ خلاف مراست

حضرت عمر خیام رحمۃ اللہ علیہ نے جس رنگ میں رباعی تجرید عنوان کی ہے اُس سے یہ منشا نہیں کہ لوگ اس دنیا میں رہ کر مجرد رہیں اور اس دنیا کی منڈی کو اپنے ہاتھوں بے رونق اور غیر آباد بنا کر چلتے ہوں بلکہ یہ کہ :۔

جو شخص اپنی زندگی باوجود انواع واقسام کے تعلقات کے بھی تجریدی رنگ میں بسر نہیں کرتا اور ان تعلقات کو موجب شر و شرارت نہیں جانتا وہ اس دنیا میں رہ کر خوش اسلوبی سے نہیں گزار سکتا اس رباعی میں تجرید سے مراد استقامت اور استقلال ہے کیونکہ دوسرے شعر کے مصرع اول میں خاطر فارغ جو لایا گیا ہے اُس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے یعنی جب تک دنیا میں رہ کر فراغ خاطر نہ ہو تب تک انسان کی زندگی بخوش اسلوبی نہیں گزرتی فراغِ خاطر اس طرح پر حاصل نہیں ہوتا کہ انسان قطعِ تعلقات کر کے فقیر ہو جائے یا صحرا کی راہ لے کیونکہ اس صورت میں بھی وہ اُن تعلقات کو توڑ نہیں سکتا جو ٹوٹ نہیں سکتے۔ اس واسطے اسلام میں کہا گیا ہے ۔

لا رَهبَانِيَةَ فِي الاسْلام

یہ فقرہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ اسلام تجرید پسند نہیں ہے اور اسلام میں بعض لوگ جو مجرد بھی رہے ہیں وہ تجریدی محاسن مد نظر رکھکر نہیں رہے بلکہ اور وجوہ سے تھے اگر یہ تجریدی رنگ بھی کامل اور مفید ہوتا تو پھر دنیا کے دو بڑے رکن نبی اور فلاسفر اس کلفت میں نہ پھنستے حالانکہ یہ دونوں اس کے حامی رہے ہیں اور اپنے اپنے ذاتی عمل سے اس کا ثبوت دیا ہے ۔ ہمارے حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے النکاح من سنتی واقعی حضرت کا یہ فرمانا تمدنی رنگ میں بھی ایک حقیقت رکھتا ہے ساری قوموں میں اب بیوگان کے نکاح پر زور دیا جاتا ہے ۔ اگر فی الواقع تجرید ہی واجب اور مفید ہے تو ان بیچاریوں کو

یوں خواہ مخواہ رگیدا جاتا ہے عورتوں میں تارکہ رکھی جاتی ہی ہیں مگر ایک تارکہ کا قصہ سُن لو اور یہ قصہ محض قصہ نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے۔

ایک شہر میں ایک اچھا اور ممتاز کنبہ تھا اُس میں ایک تارکہ تھی جو کوئی بچاپونسو سال کی ہو کر مری مرنے سے اول اُس کے یہ کلمات ہیں خاندان کے تمام عورتوں اور مردوں کو بلاؤ میرا ہنیرا کیا بات کہوں گی۔

تم سب لوگ ایمان سے کہہ سکتے ہو کہ میں شروع عمر سے اب تک جس کو بچاپونسال گزرتے ہیں اللہ کے فضل و کرم سے بالکل نیک اور باعصمت رہی میرے دامن عصمت پر ایک داغ بھی نہ پڑا یہ میری جواں مردی نہیں یہ اللہ میاں کا فضل ہے۔

مگر تم سُن لو کہ باوجود اس کے بھی میری یہ حالت تھی کہ جب کبھی میں پسِ دیوار کسی مرد کی آواز سن لیتی تھی تو میرا ایک استقامت اور استقامت بھی صادقہ کے ساتھ یہ سوچا کرتی تھی کہ سب سے زیادہ گناہ جائز حقوق فطرت کا مار دینا ہے یاد رکھو اس کے بعد کسی لڑکی کو تارکہ نہ رکھنا کیونکہ یہ وہ گناہ ہے کہ جس کا اس دنیا میں کوئی معاوضہ نہیں ہو سکتا۔

بہت سی عورتیں اور مرد بھی ضبط کر سکتے ہیں مگر یہ ضبط ضبط حسنہ نہیں ہے بیوگان کا نکاح لازمی ہے۔

یہ اس عورت کے کلمات ہیں جو فی الواقع ایک مسلمہ نیک بخت تھی اُس نے اپنے افعال اور اپنے اعمال کی حکومت سے خود کو ساری عمر آزاد رکھا لیکن توسن خیال کا رکنا بہت ہی مشکل ہے بیشک محض خیالات کی دوڑ پر خدا باز پرس نہیں کرتا مگر یہ بھی ایک عذاب ہے۔

بیوگان کا نکاح شریعت نے اس واسطے مشروع کیا ہے ہاں جو عورت اپنی قوتوں اور اپنے خیالات پر بھروسہ کر کے کچھ اور ارادہ کر لے تو یہ اُس کی ہمت ہے اور شریعت اُس صورت میں کسی پر جبر نہیں کرتی شریعتِ اسلام میں نکاح بھی ایک واجبی اور ضروری کام بیان کیا گیا ہے لیکن اگر کوئی نکاح نہ کرے بوجوہ تو اُس پر کوئی شرعی گرفت بھی نہیں

البتہ اگر کوئی شخص شریعت کی ترمیم کر کے یہ کہے کہ نکاح جائز ہی نہیں اور تجرید ہر حالت میں مباح اور مفید ہے تو یہ لا رهبانیة فی الاسلام کی تردید یا ترمیم ہے اور یہ درست نہیں۔

اسلام ایک فطری مذہب ہے چونکہ فطرت نکاح کی مویّد اور مؤکد ہے اس واسطے وہ بھی اُس رنگ میں اُس کی مویّد اور مؤکد ہے اور تمدنی مراحل اور دیگر ضروریاتِ زندگی کا بھی اس پر بہت کچھ مدار ہے۔

تجرید سے مراد محض تاکدخدائی ہی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ کوئی انسان اُس وقت تک خوش اور مطمئن نہیں رہ سکتا یا اُسے فراغِ خاطر میسر نہیں آسکتا جب تک کہ وہ ایک خاص شغل یا خاص مرجع منظر نہ رکھے انسان کچھ کچھ خبطی بھی ہے یا جنونی اُسے ایک خبط اور جنون کی سی اپنی حالت کے مطابق ضرورت رہتی ہے اور اس صورت میں وہ دوسرے مشاغل اور دوسرے امور سے الگ ہو کر صرف ایک ہی امر کو مدنظر رکھ کر تفریح حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے دیکھو بعض شطرنج میں بھی ایک تفریح پاتے ہیں بعض پتنگ بازی میں بعض شعر اشعار میں بعض راگ میں بعض شکار میں بعض مطالعہ میں بعض سیر و سیاحت میں اور بعض حسن پرستی میں اپنے اپنے مذاق کے مطابق ہر ایک شخص کا کوئی نہ کوئی مطمح نظر ہوتا ہے اور وہی اُس کے واسطے ایک حصۂ زندگی ہوتا ہے اور ایسا خبط یا جنون۔ اُس کی طمانیت کا موجب ہو جاتا ہے۔

۵

خوش آنکہ من از دانش فرہنگ بلام
آئینہ یارم گر ازیں زنگ برآئیم

یہ تجرید حسب رائے حضرت عمر خیام رحمۃ اللہ علیہ سب سے زیادہ
انسب تجرید ہے اور اس تجرید سے دنیا کے بہت سے کام بھی
چل رہے ہیں وہ سبب یہ کہ دنیا میں ہر کام بھی کر کے ان کا
حصہ بھی پورا کرکے خصوصیت سے ایک کام مطمح نظر رکھ لیا جاوے
جس طرح ہر انسان سب جگہ پر پھر پھرا کر رات کو اپنے گھر میں آکر
اپنے بستر پر آرام کرتا ہے اس وقت جو کچھ اسے لطف آتا ہے
اور مصیبت میں بھی وہ جو کچھ طمانیت پاتا ہے وہ گویا ایک تجرید ہی
کا صدقہ اور اثر ہوتا ہے ہر شخص کا جدا جدا گھر ہونا ایک تجرید ہی ہے
اور یہی فراغ خاطر کا موجب بھی ہے۔
مائیہ تجرید کیا ہے سب علائق سے رستہ آشنا ہو کر صرف ایک
ہی علاقہ سے وابستہ رہنا یا اس سے لذت یاب ہونا یا جو
لوگ مذہبی رنگ میں خدا رسیدہ اور خدا پرست ہوتے ہیں
وہ دنیا سے باہر نکل جاتے ہیں یا کھاتے اور پیتے ہیں زندگی
کی اکثر منزلیں وہ بھی طے کرتے ہیں اور اس دنیا میں رہتے
بھی ہیں لیکن چونکہ ان کا راس الشغل صرف خدا یا خدا پرستی
ہوتا ہے اس واسطے انہیں خدا پرست اور خدا رسیدہ کہا
جاتا ہے ورنہ ہوتے وہ بھی اس دنیا میں ہیں۔

نہ دنیا از خدا غافل شدن
نہ زر و نہ سیم و نہ فرزند و زن

اس دنیا میں سوائے خدا پرستی کے اور بھی طریقے دوسرے
لوگوں کے واسطے تجرید کے ہیں قرآن مجید میں آیا ہے

کل حزب بما لدیھم فرحون

یہ بھی اسی تجرید ہی کی جانب اشارہ ہے یوں سمجھو کہ یہ رباعی
حضرت عمر خیام کی اسی آیت کریمہ کی تصریح اور تفصیل میں ہے
ہر شخص کو کوئی نہ کوئی تجریدی رنگ رکھنا چاہئے کیونکہ اس کے
بغیر زندگی کے دن اچھے نہیں گزرتے اور ایسا تجریدی رنگ
دنیا سے نکل کر حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ اس دنیا میں رہ کر آنکھیں
بند کرکے اور کانوں میں روئی دیکر یہ کہنا کہ دنیا
اور مناظر دنیا سے بہت پیچھے ہٹ گیا ہوں ایک فضول ادعا ہے
مردود ہے جو اس دنیا اور اس کشمکش میں رہ کر کوئی تجریدی
رنگ رکھتا ہو اور سب سے بڑا تجریدی رنگ خدا پرستی اور خدا
پژوہی ہے اور اسی میں فروغ خاطر کا حاصل ہوتا ہے
اور یہی حقیقی تجرید ہے۔

فقط

دیدار یار از لب بام مرا بس است
زاں مہ جبیں تسلی عام مرا بس است

سلطان احمد

رباعی عمر خیام

آنہا کہ بکام دل جہاں داشتہ اند
ناکام جہاں بجائے بگذاشتہ اند
تو پنداری کہ جاوداں خواہی ماند
پیش از تو ہم ایشاں ہمچو تو پنداشتہ اند

صانع قدرت نے یہ آلہ بھی عجیب بنایا ہے دل کش آوازیں مفید باتیں اسی کے ذریعہ سے دل نشین ہو جاتی اور روح کی غذا بنتی ہیں سبحان اللہ قوتِ سامعہ بھی کیسی نعمتِ عظمیٰ ہے خدا کی دی ہوئی نعمتیں سامعہ، باصرہ شامہ وغیرہ ایسی ہیں کہ ایسی ایک نعمت بھی ایک انسان دوسرے کو نہیں دیسکتا - آنکھ - کان - ناک - زبان - صانعِ قدرت کے وہ آلات ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی بیکار ہو جائے تو انسان کی قدرت نہیں کہ پھر اُس کو کارآمد بنا سکے - اندھے کو چشم بینا - بہرے کو گوش شنوا - گونگے کو زبانِ گویا - کیا انسان دیسکتا ہے؟ ہرگز نہیں - پھر تعجب ہے کہ انسان ایسی اور اس سے بڑھکر بھی نعمتیں پا کر خدا کا شکر گزار نہ ہو - ذراسی بھی تکلیف پہنچے تو وہ اپنے خالق اپنے رازق، رؤف و رحیم غفور و کریم خدا کی شکایت اور وہ بھی کس سے اپنے جیسے لوگوں سے کرنے لگے اور یہ نہ سوچے کہ اس میں اُس کا اپنا قصور ہے یا اُس حکیم علی الاطلاق نے ناحق بھی اُس کو تکلیف میں ڈالدیا ہے حال آنکہ خدائے عزوجل کسی کو تکلیف نہیں دیتا لایکلف اللہ نفساً الا وسعہا اور انسان کو ہدایت فرماتا ہے ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ افسوس ہے کہ انسان راحت میں تو خدا کے ذکر و شغل سے غافل ہے اور آفت و مصیبت میں اور وہ بھی جو اپنی طرف سے یا اپنے ہم جنسوں کی طرف سے پڑے تو خدا کی شکایت کرے - سچ ہے ان الانسان لربہ لکنود خدا نے انسان کو جتنے اعضا دئے ہیں اُن سے لذت حاصل کرنے کے لئے دنیا میں ہزاروں نعمتیں بھی پیدا کر دی ہیں اور اُن نعمتوں سے جائز لذت اٹھانے کا حکم بھی دیدیا ہے - اپنے جسم کی راحت اپنی روح کی لذت - اور وہی خدا کا حکم بھی اور شکرِ نعمت کرنے پر زیادہ عطا کرنے کا وعدہ بھی لئن شکرتم لازیدنکم اور اس پر بھی حضرتِ انسان کفرانِ نعمت اور خدا کی شکایت کئے جاتے ہیں - کہنے - سننے - دیکھنے - اور کھانے پینے کی بے حساب اچھی چیزیں موجود - مگر مائل ہونگے تو بری چیزوں کی طرف جو تکلیف دینے والی عزت لینے والی ہوں عقل نہ رکھتے ہوں تو عقل والوں کی بات بھی نہیں سنیں گے انسان ہو کر اپنے تئیں حیوانِ مطلق کی طرح بنا دینگے اور پھر سمجھیں گے کہ ہم بھی انسان ہیں واہ ری انسانیت "بریں عقل و دانش بباید گریست"۔

کان اور اعضا کی طرح چہرہ کی زینت ہے خصوصاً صنفِ اناث کے کان تو ظاہری زیب و زینت سے کان زر ہوتے ہیں آمیال بالیاں - کرن پھول جھمکے - بندے وغیرہ کان کی شان کو دوبالا کرنے والے زیور ہیں - بچوں کی تادیب و تنبیہ کے لئے بھی کان سے کام لیا جاتا ہے یعنی گوشمالی یہ ایک طرح کی سزا ہے - صاحب کتنا ہے

۵

گوشمال آخر شود دستِ نوازش ساز را سرکش گر گوشمالی می‌دہد دوران ترا

تعلیم تعلم کو کانوں سے جو مدد ملتی ہے ظاہر ہے۔ اگر عورتیں ظاہری زینت کی طرح باطنی زینت یعنی استماع وعظ و نصیحت کی طرف کان لگائیں تو زنانِ جہاں سے حورانِ جناں ہو جائیں مگر اکثر عورتیں زیور پہنکر اپنے کان کو کان زر سمجھتی ہیں اور بعض تو زیور بکثرت پہنکر کانوں کی خوبی کو بگاڑ لیتی ہیں "وہ پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹے کان"۔ عورت ہو یا مرد چاہئے کہ استماع مواعظ و نصائح سے کانوں کو کان زر بنا لے۔

سُن اے انسان! مواعظ و نصائح پر کان لگا۔

اے انسان! بُری باتوں کو ایک کان سے سُن کر دوسرے نکالدے اور اچھی باتوں کو دلنشین کر

اے انسان! اگر بُری باتوں کو سنکر دل میں جگہ دیگا تو ان سے جو نتائج نکلیں گے وہ تیری آبروریزی و تباہی کا باعث ہونگے

اے انسان سُن! جن باتوں کو سننا تو پسند نہ کرے انکو دوسرا کیوں پسند کرے۔

اے انسان! اچھی باتیں سنا اور اچھی باتیں سُن۔

ع

ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سُنے

اے انسان! خدا سمیع و بصیر ہے تیری ہر ایک بات کو سنتا اور تیرے ہر ایک کام کا دیکھتا ہے۔ اب تو جو کام کر یہ سمجھ کے کر کہ خدائے سمیع و بصیر حاضر و ناظر ہے؛

ذیشان

ایک طوفانی منظر

ایک انگریزی علم ادب کے مضمون کا خاکہ

(۱) رات قیامت کی تاریک زمین کوسوں دور گھٹا ٹوپ بادلوں میں لہریں مارنے والی بجلی دم گھونٹنے والے سیل ہوا کے جھکڑ متلاطم سطح سمندر پر مصیبت کی کڑی منزلیں طے کر رہا تھا یہ جہاز زمانہ حال کی ایجاد نہ تھی کہ ضروریات زندگی سے آراستہ برقی روشنی جلتی شیشوں میں بند چمکتے چاند کی خوشنما صورت پیدا کرتی تھی مسافرین عہد عتیق کے مسافر تعلقات دنیا سے بے تعلق راحت و آرام کے جویا۔ دولت کے مسرف۔ بادۂ ناب میں مست۔ عیش کی بہتات میں سرشار تھے یہ وہ لوگ تھے جن کی عمروں کا زیادہ حصہ اس خدائی میں ناخدائی کرتے گذرا تھا۔ خود ہی مسافر تھے اور خود ہی ملاح۔ خود ہی آقا تھے اور خود ہی غلام۔ جو ہی بیمار اور خود ہی تیماردار ملکوں ملکوں تجارت کی دوا دوش میں دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھتے اور اپنے دست و بازو کے فیض سے یگانے تو یگانے بیگانوں کو بھی بے فیض نہ چھوڑتے تھے۔

رات آدھی سے کچھ زیادہ گزر چکی تھی جہاز منزل مقصود سے بے رخ جائے قیام کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ دیو سیاہ ہوا کے سناٹے میں گرج گرج کر برس رہے تھے۔ گرگ باراں دیدہ ملاح ایک گھنٹہ کی لگاتار بارش سے گھبرا اٹھے برفانی گولیوں کی مسلسل پڑنے والی چادر نے دم بھر میں عالمِ موجودات کی کایا پلٹ دی تپتے تپیا ہوا ہو کر اڑ گئیں جنگل صاف میدان خاک سے پاک ہو گئے۔ نالے ندیوں سے۔ ندیاں بڑھ کر سمندر سے ہمکنار ہوئیں۔ سمندر ابل ابل کر آنکھیں دکھانے لگا اربعہ عناصر کی اس جنگ عظیم میں جاندار ہستی کا کیا ذکر ٹیلے پہاڑ بھی اس خوفناک ضرب کی تاب سے بیتاب ہو گئے۔

(۲) طوفان ختم ہو چکا تھا رات کی سیاہی ڈھلکر سورج کی چمکدار کرنیں نیلے آسمان پر دوڑنے لگیں تھیں منہ زور ہوا اطمینان کی سوا ئیں بھر رہی تھیں۔ اہل بستی جو رات بھر کی متوحش حالت کا مقابلہ کرتے کرتے تھک چکے تھے ابھی بستروں سے الگ بھی نہ ہونے پائے تھے۔ کہ ایک تھراتی آلاف جہاز کی آواز پردہ گوش سے ٹکرائی۔ سونے والے بستروں سے اچھل پڑے اور بدحواسی کی مجنونانہ دوڑ شروع ہوئی۔ سب کنارِ آب کی طرف ایک دوسرے سے گوئے سبقت لیجانے کیلئے بے تحاشہ بھاگ رہے تھے۔ خوف دلانے والی پرجوش سمندر کی صورت رات بھر کی طوفان خیز جنگ کے بعد بھی خوفناک تھی۔ لہریں سمٹ سمٹ کر سیاہ چٹانوں پر ٹکریں مارتی تھیں اور غضبناک فیل مست کی طرح سنگیں اٹھا اٹھا کر پرشور آواز سے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتی تھیں اور پھر تھک تھک کر دھکتی گرجتی الغاروں گر کر غائب ہو جاتی تھیں گھبراہٹ اور پریشانی میں سمندر پر نگاہ ٹھہرتی تھی۔ جہاز کنارے سے بالکل قریب سامنے تھا لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھتے لیکن سیاہ لہروں کے اژدر اور ان کے جھاگ سے بھرے ہوئے سفید سروں کے سوا اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ ایک نیم برہنہ ملاح نے جو نزدیک کھڑا تھا۔ انگلی سے اشارہ کیا۔ ایک بے حس شکستہ جہاز دکھائی دیا جس کے ٹوٹے پھوٹے بازو بچے کھچے۔ بادبان وحشت انگیز رسیوں کے ڈھیر ہوا میں پھڑ پھڑا رہے تھے اور بے رحم امواج کے رحم و انصاف پر جانکنی کے عالم میں دم توڑ رہا تھا۔ درد انگیز غمگین صدائیں کنارے سے اٹھ رہی تھیں جہاز لہروں کے عمیق غار سے موج کی سطح پر ابھرا چار شخص جو پھٹے بادبانوں کی رسیوں سے چمٹے ہوئے نفس آخری کے لئے جدوجہد کر رہے تھے نظر آئے۔ ان میں کا ایک نوجوان جانِ شیریں کے بچاؤ کے لئے مستول کی سب سے بلند چوٹی سے لپٹا ہوا۔ نظرِ حسرت سے اُن ہمجنسوں کو دیکھ رہا تھا جو کنارِ ساحل پر کھڑے رفتگانِ آب کا مشاہدہ کر رہے تھے جہاز لہروں کی تھپیڑ سے سراسیمہ طوفان ہوا سے بدحواس۔ ادھر اُدھر بھاگتا اور دریا میں اچھلتا کودتا پھرتا تھا مگر عذاب آخرت سے رہائی نہ ہوتی تھی موج ہوا سے جہاز کی گھنٹیاں بج رہی تھیں اور بدقسمت انسانوں کا پیام

مرا دل منزل عشرت چہ امن و عیش چوں ہر دم
جرس فریادمی دارد کہ بر بندید محملہا

ہم تک پہنچ رہا تھا۔ دل دھڑک رہے تھے موجیں اچھل اچھل کر اپنے شکار پر وار کر رہی تھیں بچے چیختے عورتیں حالت کرب میں مٹھیاں دبائے چپکے چپکے رو رہی تھیں کچھ مدد کے لئے دوڑ رہے تھے کچھ وارفتگی میں ایک دوسرے سے مدد کے لئے خوشامد کر رہے تھے گو مدد کے اسباب ہر طرح مہیا تھے لیکن مدد کرنا

کسی طرح ممکن نہ تھا۔ جہاز خوف سے تھرتھرا رہا تھا تین انسان قعر سمندر میں کب کے پہنچ چکے تھے مغرور بادبان فنا تھا۔ ناخدا میں اب اس شخص کے گرد اڑ رہا تھا جو زندگی اور موت کے درمیان ان تختوں پر کھڑا تھا جو مستول سے جڑے ہوئے پانی پر ڈگمگا رہے تھے اس آخری ناخدا کے رخت سفر میں لباس کے چند شکستہ ٹکڑے اور سر پر ایک سرخ ٹوپی تھی جسم جا بجا سے زخمی اور خوفناک ضرب کے پرخون نشانات دکھائے دے رہے تھے موت یقینی تھی مگر اطمینان کی مسکراہٹ چہرے پر کھیل رہی تھی۔

(۳) ہیم جہاز کو سب سے الگ کھڑا دیکھ رہا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں کسی غیر معلوم قوت کے اثر سے اس کی حالت میں اضطراری کیفیت نمایاں ہو چلی تھی کچھ لوگ پیچھے کھڑے تھے ہیم نے پلٹ کر ان کے کان میں کچھ کہا رسی کمر سے جلد جلد باندھی گئی اور یہ بیچین ہو کر ساحل سے ٹکرا کر واپس ہونے والی ایک لہر کے ساتھ ہی سمندر میں کود پڑا۔ موجیں ابن آدم کی انسان کی دلیری سے اور بھی غضبناک ہو گئیں۔ پہاڑ کی بلندی تک اٹھایا۔ سمندر کی تہ تک پہنچایا۔ مگر ہیم ایسی گیدڑ بھبکیوں کو کب دھیان میں لانے والا تھا۔ برسوں موجوں کی گود میں کھیل کر پرورش پائی تھی۔ لہروں کو چیرتا۔ پانی کو کاٹتا آگے بڑھتا رہا۔ جہاز زیادہ فاصلہ پر نہ تھا لیکن ہوا کا زور۔ بگڑے پانی کی قوت سے دم پھولنے لگا دو ہی چار ہاتھ اور باقی ہوں گے کہ ہاتھ پیر شل ہو گئے۔ ہیم اس حالت میں بھی اپنے مقصد کو نہ بھولا مگر اب جسم میں سکت باقی نہ رہی تھی ایک آواز منہ سے نکلی نگاہیں دوچار ہوئیں اور مدت کے بچھڑے ہوئے دو سنبھل نے اس بیکسی کے عالم میں ایک دوسرے کو پہچان کر محبت اور ہمدردی سے ہاتھ اٹھائے روحوں نے ابدالآباد تک ساتھ رہنے کی قسم کھائی۔ جہاز چکرایا۔ موجیں سمٹیں۔ سمندر نے منہ کھول کر مستول کی چوٹی تک نگل لی۔ اور دم کے دم میں حباب پھوٹ پھوٹ کر پانی کی سطح ہموار ہو گئی۔

رسی کھینچی گئی اور دو مردہ جسم آپس میں لپٹے ساحل پر نکال لیے گئے۔

محمد احسن صدیقی

جذبات اکبر

ذوق ہوائے کوچۂ قاتل کو کیا کروں　　وہ مضطرب کہ پردۂ محمل کو کیا کروں

مہلک سہی یہ شوق مگر دل کو کیا کروں　　مانا جناب خضر مرے مہربان ہیں

اظہار اضطراب کا شائق نہیں ہوں میں　　پائے ضعیف و دوری منزل کو کیا کروں

پہلو میں لیکن اس دل بسمل کو کیا کروں　　قطع نظر گلوں سے۔ نہیں مانع جنوں

مجنوں نگاہ شوق سے خواہاں کہ ہو بلند　　بوئے بہار و شور عنادل کو کیا کروں

ہمارے مطالعہ کی میز

رموز بیخودی یعنی حیات ملیہ اسلامیہ مصنفہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے بیرسٹرایٹ لا، لاہور۔

ہم نے اس کے ایک ایک شعر کو بنظر غور و تعمق پڑھا۔ پوری کتاب رموز و اسرار کا گنجینہ ہے ہم اس پر کیا لکھیں اس کے مصنف کا نام خود اس کی خوبیوں کا ضامن ہے۔

اس مثنوی میں ملت اسلام کے حیات بخش اسرار کو بیان کرکے ان تاریک راہوں میں مشعل ہدایت جلائی ہے جہاں چشمہ حیات اس وقت پنہاں ہو رہا ہے۔ اس زمانہ میں اسی کی ضرورت ہے کہ کوئی اس آگ کو جو ہماری بے التفاتیوں کی وجہ سے راکھ میں دبی ہوئی ہے آہستہ سے پھونک دے تاکہ وہ پھر روشن ہو جائے۔ اسلام کوئی جدید بات نہیں چاہتا بعضوں نے نادانی سے کہئے یا خود غرضی جانئے اس میں نئے نئے گل کھلائے اور اسکو بدنما سمجھنے لگے کسی باغ کے اصلی درختوں کو خزاں سے مرجھایا ہوا دیکھ کر ان کی آبیاری کرنا اور ان کی موجودہ خوبیوں کو نمایاں کرنا چاہئے نہ یہ کہ ان درختوں کے عوض دوسرے پودے لگانے کی کوشش کرنا اور وہ بھی اس سرزمین کے جن سے ہم ناآشنا ناواقف بے بہرہ۔ ہمارے مقاصد کے منافی کسی آئینہ کا زنگ دور کرنے میں جو فائدہ اور جو خوشنمائی مدنظر ہے اس پر نقش و نگار بنانے سے وہ بات کبھی حاصل نہیں ہوسکتی غرض ڈاکٹر صاحب موصوف نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ قابل ستائش اور لائق تقلید ہے ؎

خلاف پیمبر کسے رہ گزید — کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

اب ہم بعض مقام سے نمونے کے طور پر اس مثنوی کے کچھ شعر پیش کرتے ہیں جس سے ناظرین کو ڈاکٹر صاحب کی طلاقت لسانی اور زور طبیعت کا اندازہ ہوسکے گا اور معلوم ہوجائیگا کہ عارف رومی کی مثنوی کا مطالعہ اور میرزا بیدل کے صوفیانہ طرز انشاد کا تتبع ایک طبع وقاد کو کیسا روشن کر دیتا ہے چنانچہ مثنوی کی ابتدا میں اپنے متعلق تحریر فرماتے ہیں ناظرین انداز بیان کو ملاحظہ فرمائیں خصوصاً تیسرے شعر کا مصرع ثانی داد طلب ہے ؎

از سخن آئینہ سازم کردہ اند — وز سکندر بے نیازم کردہ اند
بار احساں بر نتابد گردنم — در گلستاں غنچہ گردد دامنم
سخت کوشم مثل خنجر در جہاں — آب خود می گیرم از سنگ گراں
پروہ رنگم شیشہ نیستم — صید ہر موج نسیمے نیستم
در شرار آباد ہستی اخگرم — خلعتے بخشند مرا خاکسترم

شعر چہارم کی بندش بھی ملاحظہ طلب ہے۔

پھر اسی سلسلے کے ضمن میں لکھتے ہیں:- ؎

اشک خود بر خویش میریزم چو شمع — با شب یلدا درآویزم چو شمع
جلوہ را افزودم و خود کاستم — دیگراں را محفلے آراستم

ان دونوں شعروں کو مکرر پڑھئے اور لطف اٹھائیے

اس کے بعد افرادِ ملت کے اجتماع کی تعریف میں ایک شعر کہا ہے جو اس سے بڑھ کر جامع ہو نہیں سکتا ؎

فرد و قوم آئینۂ یک دیگر اند
ہم خیال و ہم نشین و ہمسر اند

اختلاطِ افراد اور ضرورتِ نبی کے بیان میں لکھتے ہیں ؎

مردمان خوگر بیکدیگر شوند　　سفتہ در یک رشتہ چوں گوہر شوند
تا خدا صاحبدلے پیدا کند　　کز فغانے نغمہ انشا کند
بندہا از پا کشاید بندہ را　　از خداوندان رُباید بندہ را
نکتۂ توحید باز آموزدش　　رسم و آئین نیاز آموزدش

بیان توحید

درجہان کیف و کم گردید عقل　　پے بمنزل برد از توحید عقل
ورنہ این بیچارہ را منزل کجاست　　کشتیٔ ادراک را ساحل کجاست
دیں از و حکمت از و آئیں از و　　زور از و قوت از و تمکیں از و
چوں مقامِ عبد محکم شود　　کاسۂ دریوزہ جامِ جم شود

مصرعِ آخر کو مکرر پڑھئے!

اسی توحید کے ضمن میں اتحاد و اتفاق کے متعلق لکھتے ہیں ؎

ملت از یک رنگیٔ دلہاستے　　روشن از یک جلوہ ایں سیناستے
قوم را اندیشہا باید یکے　　در ضمیرش مدعا باید یکے

یاس و خوف کی مذمت میں لکھتے ہیں ؎

مرگ را ساماں ز قطع آرزوست　　زندگانی محکم از لا تقنطوا ست
نا امیدی ہمچو گور افشاردت　　گرچہ الوندی ز پا می آوردت
قوتِ ایماں حیات افزایدت　　وردِ لاخوف علیہم بایدت
بیم چوں بند است اندر پائے ما　　ورنہ صد سیل است در دریائے ما

نعت میں یہ اشعار بھی قابلِ حفظ ہیں ؎

دین فطرت از نبی آموختیم　　در رہِ حق مشعلے افروختیم
این گہر از بحرِ بے پایانِ اوست　　ما کہ یک جانیم از احسانِ اوست
تا نہ این وحدت ز دستِ ما رود　　ہستیٔ ما با ابد ہمدم شود
رونق از ما محفلِ ایام را　　او رسل را ختم و ما اقوام را
خدمتِ ساقی گری با ما گذاشت　　داد ما را آخریں جامے کہ داشت

قطع اخوت کی مذمت میں کہتے ہیں ؎

مردمی اندر جہاں افسانہ شد　　آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند　　آدمیت گم شد و اقوام ماند

ذیل کے اشعار آئین و قوانین کی تعریف میں کیا خوب کہے ہیں اور کیا اچھی تشبیہیں تلاش کی ہیں ؎

برگ گل شد ز آئیں بستہ شد　　گل ز آئیں بستہ شد گلدستہ شد
نغمہ از ضبطِ صدا پیداستے　　چوں پریشاں شد صدا غوغاستے
در گلوئے ما نفس موجِ ہواست　　چوں ہوا پابندِ نے گردد نواست

مصنف نے سب سے زیادہ کمال یہ دکھایا ہے کہ آخر میں تمام مثنوی کا خلاصہ سورۂ اخلاص کی تفسیر میں بیان کر دیا ہے۔ اس میں بھی بعض بعض شعر چستیٔ بندش اور جدتِ معانی کے لحاظ سے بے مثل کہے ہیں۔ چنانچہ ایک مقام پر کہتے ہیں ؎

گر باللہ الصمد دل بستۂ　　از حدِ اسباب بیروں جستۂ
گرچہ باشی مور و ہم بے بال و پر　　حاجتے پیشِ سلیمانے مبر
خود بخود گردد در میخانہ باز　　بر تہی پیمانگانِ بے نیاز

آخری شعر اگر سو بار بھی پڑھا جائے تو سیری نہیں ہو سکتی

پھر اسی کے ضمن میں کہتے ہیں ؎

بے نیازی ناز ہا دارد بسے　　ناز او انداز ہا دارد بسے
تا کجا طوفِ چراغِ محفلے　　ز آتش خود سوز اگر داری دلے

اس آخری شعر کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ استغنا کے متعلق اس

زیادہ کوئی نہیں لکھ سکتا اس کی تقطیع بھی اتنی ہی خوبصورت اور چھوٹی ہے جتنی کہ اس مثنوی کی بحر ہے۔ جابجا نذرانات کا مصداق ہے کاغذ نہایت اعلیٰ درجہ کا چکنا ولایتی ہے۔ اس مثنوی میں محاسن کے سوا ہم کو کوئی بات نظر نہیں آتی۔ البتہ بعض قافیوں متعلق ہم کو پس و پیش ہے لیکن مصنف نے اُس قسم کے قافیہ کو بار بار لکھ کر اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ انھوں نے اس میں اجتہاد کیا ہے اور وہ اس کو عمداً کہتے ہیں ماہرین فن سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ فن شعر میں جو عیب جان بوجھکر رکھا جائے اُس کا شمار عیب میں نہیں ہوتا وہ شبہ یہ ہے کہ مضارع کی دال کو حرف روی قرار دیا ہے جیسے کشند کا قافیہ نہد اور شود کا خورد جو ایطا سمجھا جاتا ہے اس لئے کہ دونو جگہ دال مضارع کی ہے جس سے تکرار قافیہ بیک معنی ہو گئی۔ البتہ نہد کا قافیہ اگر جہد اور شود کا قافیہ رود کیا جائے تو یہ نقص باقی نہیں رہتا اس قسم کے دو چار شعر ہم یہاں نقل کرتے ہیں ؎

چوں ز خلوت خویش را بیروں کشند — پائے در ہنگامۂ جلوت نہند

عشق صید از زور بازو افگند — عقل مکار ست و دامے می نہد

تا قوی از حکمت اشیا شود — ناتواں باج از توانایاں خورد

ایک جگہ الف و نون فاعلی یا حالیہ کی تکرار ہو گئی ہے ؎

در سکوت نیم شب نالاں بدم — عالم اندر خواب و من گریاں بدم

بعض جگہ قافیوں میں اقوا کو جائز رکھا ہے جو اختلاف توجیہ سے پیدا ہوتا ہے یعنی ماقبل روی کی حرکت میں اختلاف مثلاً ؎

زندہ فرد از ارتباط جان و تن — زندہ قوم از حفظ ناموس کہن

از [illegible] الٰہ امر حیات — پاک شست آلودگیہائے کہن

ثابت و سیارۂ گردوں وطن — آں خداوندان اقوام کہن

ربط ایام است مارا پیرہن — سوزنش حفظ روایات کہن

اشعار بالا میں حرف روی کے ماقبل ایک جگہ مضموم ہے اور ایک جگہ مفتوح ہے یعنی فارسی میں لفظ کہن بضم ہائے ہوز ہے بالفتح نہیں ہے جس طرح نظامی علیہ الرحمہ کہتے ہیں ؎

بپرسید آئیں چہ بہائے کہن

چہ پیرایہ را شاید از اصل و بُن

اُردو کہنے والے البتہ چمن و وطن کے ساتھ کہن کا قافیہ کرتے ہیں مصنف سے لاہور کے پتہ پر مل سکتی ہے قیمت شاید (عمر) رکھی گئی ہے ؏

مثنوی میگھ دُوت باسم تاریخی غربت شیدا

ہندوستان کے نامور قدیم شاعر کالی داس کی نظم میگھ دوت کو جناب صمیم بریلی نے اُردو کا جامہ پہنایا ہے ہم بھی اس سے لطف اندوز ہوئے اصل کتاب کو تو ہم نے پڑھا نہیں اور نہ پڑھ سکتے ہیں اس لئے کہ اس زبان سے ہم نا آشنا ہیں جس میں کالی داس اپنے انوکھے خیالات نظم کیا کرتے تھے لیکن اس ترجمہ کو دیکھکر ہندی شاعرانہ تخیّل کے ذوق سے ہم مست ہوئے بغیر نہ رہ سکے گویا ترجمے نے اس شراب کو دو آتشہ بنا دیا ہے کیوں نہ ہو ہندی تخیّل اُردو کی بندش سونے پر سہاگا ہے۔ ملک کی خصوصیات کچھ اور ہی تاثیر رکھتی ہیں۔ ان سے فرحت ہم واقف اُن کے کیف سے ہم باخبر۔

جن چیزوں کو ہم نے دیکھا ہی نہیں ان کی تشبیہوں کا دل پر کیا اثر ہو گا ایران کی بلبل ہزار داستاں کے نغموں کا ذکر سنکر ہم اس قدر خوش نہیں ہو سکتے جس قدر ایک کوئل کی کوکو سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ سنبل و سوسن اور نسرین و نسترن کے بیان سے ہمارا دل و دماغ آشنا ہو تا نہ ہو

جیسا کہ چنپا، چنبیلی، کیسر، مولسری کا ذکر سنکر ہو سکتا ہے۔
ہم بعض بعض مقام سے کچھ شعر ناظرین کی تفریح طبع کیلئے
درج کرتے ہیں جن سے حسنِ تخیل اور خوبیٔ بندش دونوں کا
اندازہ ہو سکتا ہے۔
جنگل اور ندی کا کیا دلفریب سماں لفظوں میں دکھایا ہے

؎

پھولوں سے دشت ہوگا سارا چمن — ان کی خوشبو سے مور ہونگے مگن
راہ لڈا اُڑ کے وہ بتائیں گے — ناچ کر تجھکو وہ رجھائیں گے
بگلوں کی جب قطار اُڑیگی وہاں — کیا کہوں ہائے تجھ سے میں وہ سماں
ہیں وہاں ارجن اور مولسری — مست ہوئے خوشی سے اُنکی جی
موروں کی کچھ عجب ادائیں ہیں — دلکش اُن کی مگر صدائیں ہیں
مور پھولے نہیں سمائیں گے — ہونگے باہر وہ اپنے جامے سے
اپنی مادہ کو وہ رجھائیں گے — مست ہو کر ادھر وہ جائیں گے
جب خمیدہ کریں گے اپنا تن — دم سے لگ جائیگی وہ ہر گردن
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لگے گی تجھے — کرم ارجن چنبیلی سے ہیں بسے

محبوبوں کی تعریف میں چند اشعار ہم مختلف مقامات سے نقل کرتے ہیں ؎

واں جواں عورتیں نہاتی ہیں — ٹیکہ کیسر کا وہ لگاتی ہیں
کانوں کی لو میں کُند کی کلیاں — کتنا پیارا دکھائیں گی وہ سماں
پھول ملکے ہیں جو چنبیلی کے — ہیں لڑی بن کے چوٹیوں میں گندھے
پھولنے والے ہیں کدم کے جو پھول — چشمِ مشتاق کو ہے ہیں حصول
جب پپیہے کا وہ سنیں گے شور — اور کم ہوگا بس دلوں کا زور
پی کہاں پی کہاں کی رٹ سنکر — دونوں ہاتوں سے تھام لیں گے جگر
کانوں میں گل لگے ہیں جو سو بار — جو نہ چاہے انہیں تو دالگی مار
بالیاں انکی موتیوں سے بھری — گویا اپنے مقام پر ہیں پری

کیتکی اور کنول کے پھولوں سے — تازے تازے وہ ہار ہیں گوندھے
پھولوں کی بالیاں ہیں کانوں میں — شور ہے ان کا داستانوں میں
بالوں کو وہ سمیٹ کر اک بار — جوڑے باندھیں گی وہ پری رخسار
نظر آئے گا بجلی کا جگنو — جھومنے میں وہ ہوگا زیبِ گلو
اُس پہ قوسِ قزح کی سی ہیکل — دیکھنے والوں کو نہ آئے کل
چھیڑ دینے ہوا کے آخرکار — سرکے گا آنچل اُن کا سو سو بار
اس سبب سے عجب نہیں دیکھیں — گنگا جمنی گلوں کی زنجیریں
لالِ کندہ رو کی طرح ہیں وہ لب — دُرِ دنداں ہیں یا کہ صنعتِ رب

ترجمے کے سوا جہاں جہاں مصنف نے اپنے ذاتی خیالات
ظاہر کئے ہیں وہ بھی بلند ہیں۔ چنانچہ دیباچہ اور دو ساقی نامے
اس کے شاہد عدل ہیں:

لیکن اس کے ساتھ مصنف کو ان کی رنگین بیانوں نے
ایسا محو کر رکھا کہ بعض اُمور میں قواعد و اصول فن شعر او محاورۂ
زبان کے خلاف عمل کرنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ ان میں سے
بھی بعض شعر ہدیہ ناظرین کرتے ہیں:- ؎

دلکش ہر ایک رنگ ہے اسکا — خوشنما ڈل ہے سنگ ہے اس کا

اس شعر کے پہلے مصرع میں ہر ایک کی ہا تقطیع سے ساقط ہے

؎

چھوٹی چھوٹی ادھر اُدھر ندیاں — کچھ نیا ہی دکھا رہی ہیں سماں
جب چلے نربدا ندی سے تو — ہو مبارک سفر یہ اے خوشخو
اس ندی کی بھی چال تو دیکھے — کھا کے بل مست چال چلتی ہے
چلتی ہے زور سے ہوا جو شتاب — ہٹتی ہے تب ندی سی چادرِ آب

ان تمام شعروں میں ندی بروزن بدی خلاف محاورہ ہے

؎

رنگ سا یہ ندی نے جنگل میں — اُجلا پیوند سیاہ کمبل میں

اس کے مصرع ثانی میں ناپیوند کی وال تقطیع سے ساقط ہو گئی یا نیانہ کی ہی

یہ دھواں محلوں کا جھرنکوں سے پیچ کھا کھا کے باہر اُٹھتا ہے

جب چمکتے چمکتے برق تھکے تجھکو آرام بھی تو لازم ہے

جب کہ یہ تنگ و تار راہ ہو طے پھر تو چاہئے مجھے قرار ملے

چوٹیوں کو چھپائے برف پڑی ہے کیوں کنول کا نہ پھول شرمائے

کیوں نہ ہم رنگ ہوکے تجھ سے ملے تیری تہ میں بھی تو سفیدی ہے

میری الفت کی آگ اگر بھڑکے اُس کو لازم تجھے دبانا ہے

ان تمام اشعار میں ہے اور ے وغیرہ قافیہ غلط ہے اس لئے کہ ایک ماقبل ایک جگہ مکسور ایک جگہ مفتوح بغیر حرف وصل صحیح نہیں ہے اسیطرح اس شعر میں

سنگ مرمر جڑا ہے صحنوں میں

مانند جن کی چمک سے ہیرے ہیں

ہیں اور ہیں قافیہ صحیح نہیں ہے

سادہ دل لڑکیاں جو ہیں کنواری باتیں اُن کی تو ہوتی ہیں پیاری

عورتیں کنواری ہوکے خوش جب آئیں للچا للچا کے کیا عجب رہ جائیں

پاک پانی ہے یوں ہے وہ شفاف کنواری کم سن کا دل ہو جیسے صاف

ان اشعار میں کنواری بروزن فعلن موزوں ہوا ہے۔ جو بروزن فعولن چاہئے

وہاں پر بال کا سماں ہوگا گنگا جمنا کا رنگ عیاں ہوگا

اس کے مصرع ثانی میں عیاں کی تقطیع سے ساقط ہے

بھاگنے کی کریں گے وہ کوشش اڑ بگی ہوگی اک اندھیر کا ہش

اس شعر میں کوشش کا قافیہ کاہش غلط ہے

ہے یہ جوش موسم برسات خوش ہیں سب اپنی اپنی بوگی ساتھ

اور بھی اک مرن کی ہے یہ بات زندہ دل ہے یہ موسم برسات

یاد ہیں طور چشم و چتون کے ہے مشابہ وہ آنکھ ہرنی سے

اشعار بالا میں موسم برسات اور چشم و چتون غلط ترکیبیں ہیں ایک فارسی اور ایک ہندی لفظ کے درمیان عطف و اضافت صحیح نہیں ہے

نخل کہنہ سے بیٹھ کر لڑیں گے گرجنے کا جواب وہ دیں گے

اس کے مصرع ثانی میں گرجنے کی (ر) ساکن ہو گئی ہے اگر (ر) کو متحرک پڑھیں تو وزن جاتا ہے

سانسیں ہنڈی بھرے نہ کیونکر وہ جو کلیجہ مسوسے بیٹھے ہو

وہ کے ساتھ ہو قافیہ نہ کرنا چاہئے

آنکھیں ہیں لا کلام متعجب چشم آہو یہ رنگ ہے غالب

جب ہو متوجہ تجھ سے وہ خوش رو میری باتوں کو کہہ گزرنا تو

ان دونوں شعروں میں متعجب اور متوجہ کی (ت) ساکن نظم ہو گئی ہے جو غلط ہے اگر اس کو متحرک پڑھیں تو وزن جاتا ہے

تیری پتلی بھی وہ بنا آتا ہے آنسوؤں سے اُسے نہلاتا ہے

نہلا آ جلا آ کے وزن پر نہیں بنا آ کے وزن پر چاہئے ؛

لکھائی چھپائی کاغذ سب اچھا ہے قیمت ایک روپیہ مناسب ہے علی گڈھ انسٹیوٹ پریس سے درخواست کیجئے ؛

تذکرۃ الحبیب | مولفہ جناب مفتی محمد انوار الحق صاحب ایم اے ڈائرکٹر تعلیمات بھوپال۔ اس کے متعلق صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ ذکر الحبیب حبیب اسلام کے تہتر فرقوں میں کوئی فرقہ ایسا نہ ہوگا جو اس کو محبت کی نظر سے نہ دیکھے۔ فائدہ کے لحاظ سے مسلمانوں کے لئے تعلیم و تلقین کا اس سے بہتر کوئی رہنما نہیں ہو سکتا جیسا کہ خود مولف نے تحریر فرمایا ہے :-

"صرف زبانی نصیحت پر عمل کرنا زیادہ شاق ہوتا ہے
اگر وہی بات کسی واقعے کے پیرایہ میں بیان کیجائے
تو اُس پر عمل کرنا زیادہ آسان ہو جاتا ہے"
جناب مفتی صاحب کا یہ قول بھی گوش ہوش کا آویزہ بنانے
کے قابل ہے:-
"کیا یہ غیرت کی بات نہیں ہے کہ اسوۂ حسنہ نبوی کے
ہوتے ہوئے بھی ہم حسن معاشرت میں غیروں کے
نمونوں کو اپنا نصب العین بنائیں"۔
یہ قول بالکل درست ہے جس کے اخلاق کی لوح طغرائے
انک لعلیٰ خلق عظیم کے عنوان سے مزین ہو
اس کو چھوڑ کر دوسروں کے اخلاق کو نمونے میں پیش کرنا
آفتاب کے آگے مشعل جلانا اور ماہتاب کے روبرو آئینہ
دکھانا ہے۔
ہم تمام مسلمانوں کو اس متبرک کتاب کے پڑھنے کا مشورہ
دیتے ہیں۔ ہر مسلمان کے گھر میں اس کی ایک جلد ضرور رہنا چاہیے
ان تمام فوائد اور خوبیوں کے مقابل میں اس کی قیمت
صرف (عہ) بہت کم ہے ع
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

ایڈیٹر

کلام شاد

ہز ایکسیلنسی راجہ اے راجایان کشن پرشاد مہاراجہ بہادر یمین السلطنت جی سی آئی ای
(شاد یالقابہم)

اسے وصال میں مجھ سے کشیدہ ہونا تھا — مرے نصیب میں از خود رسیدہ ہونا تھا
پس فنا بھی مری خاک ہی گلی میں تری — فلک زدہ کو یہیں آرمیدہ ہونا تھا
ہمیشہ عشق کے جوہر شناس کرتے قدر — گہر کی شکل مرے آبدیدہ ہونا تھا
ابھی جہان میں چلتا قیامت کا — ذرا تو اے قد جاناں کشیدہ ہونا تھا
مثال سبزہ نہ پامال کیوں ہوتا — کہ مجھکو بعد فنا پھر دمیدہ ہونا تھا
مثال تیر جو سرکش ہو ... جاتے ہیں — ہمیں کمان کی صورت کشیدہ ہونا تھا
حسد کی وجہ سے بے برگ و بار ہونا تھا — ترے نصیب میں شاخ بریدہ ہونا تھا
مرید پیر مغاں کس لیے نہ ہوتا شاد — شراب عشق کا لذت چشیدہ ہونا تھا

مقالات حیدر

مختصر مرحلۂ طول امل کیا ہوگا
قطع یہ سلسلہ بے تیغ اجل کیا ہوگا
دور کر تیرگی دل کہ ابھی تک ہے وقت
ہو گئی صبح تو روشن یہ کنول کیا ہوگا
حرکت چرخ کی بس تیرے ہی آہنگ سے ہے
ورنہ بے صوت حدی رقص جمل کیا ہوگا
چاہئے گوشۂ دل وادی ایمن ہو نہ طور
جلوہ زار اس کا بھلا دشت و جبل کیا ہوگا
دے رہا خال ہے جو حسن دو گوش کے پاس
پہلوئے زہرہ میں وہ خفتہ زحل کیا ہوگا
بیٹھے ہیں گوشۂ عزلت میں ہم آپ تو کھیلو

ہاتھ منتِ کشِ اربابِ دول کیا ہوگا

دیکھتا ہوں کبھی حسرت سے تو کہتا ہے وہ شوخ
مجھکو تو دیکھ کے جلتا ہے تو جل کیا ہوگا

جب میں کہتا ہوں چلو ترکِ محبت ہی سہی
اس پہ وہ ناز سے کہتا ہے کہ چل کیا ہوگا

نظمؔ اک آنی و فانی ہے پھر اس سے ناراض
خالقِ لم یزل و عز و جل کیا ہوگا

آنکھ پھرنے میں جو رنجش کا نہ پہلو ہوتا
مجھ کو آہو سے زیادہ رمِ آہو ہوتا

حسرت و درد کو کچھ اور جگہ مل جاتی
کاش کے دل سے بھی خالی مرا پہلو ہوتا

جیسا رسوائیوں کا ہے مرے رونے پہ ہجوم
ایسا میلا بھی الٰہی نہ لبِ جو ہوتا

پر خطر تھی شبِ ہجراں کی سیاہی ایسی
نکل آتا بھی جو دن سہم کے جگنو ہوتا

میرے نالے جو شبِ تار کو سمٹا لاتے
صبحدم چہرۂ خورشید پہ گیسو ہوتا

ہم دکھا دیتے کہ یوں دب کے نکلتا ہے چاند
بام پر سر کو جو نیوڑھائے ہوئے تو ہوتا

سرمہ بھی دیدۂ فتاں میں لگاتا تھا ضرور
ساتھ آہو کے غبارِ رمِ آہو ہوتا

کھنچ آئے جدھر ہم کو دلِ زار نے کھینچا
جیسے کسی مجبور کو مختار نے کھینچا

نقشہ نہ کھنچا خوابِ پریشاں کا کسی سے
کھینچا تو مرے دیدۂ بیدار نے کھینچا

چھپ چھپ کے کبھی رویا تو گنہگار ہوا میں
محشر میں گریباں حشمِ دلدار نے کھینچا

جب آہ کی آثارِ سحر کے نظر آئے
گردوں کی طنابوں کو دلِ زار نے کھینچا

سولی نظر آئے گی مسیحا کو فلک پر
نالہ جو کسی دن ترے بیمار نے کھینچا

کن کن ثمروں کو قدِ موزوں نے سنبھالا
کس بوجھ کو موئے کمرِ یار نے کھینچا

میرا دلِ پرداغ ہے افشاں کا ستارہ
کاکل سے رہائی ہوئی رخسار نے کھینچا

لی ابرِ بہاری نے پرِ زاغ کی رنگت
نقشہ دمِ طاؤس کا گلزار نے کھینچا

ایسی ہے ترے ہاتھ کے بوسوں کی تمنا
اس شوق میں چلّہ لبِ سوفار نے کھینچا

کیا کیجئے اے نظمؔ کہ صیاد تھا حائل
ہم کو تو بہت نکہتِ گلزار نے کھینچا

حیدر یار جنگ طباطبائی

رباعی عمر خیام

ساقی قدحے کہ گر بتاں ناز کنند — مستاں بہ نیاز کارِ خود ساز کنند
چنداں بدہ میکن سرِ خم ہم زد — کز غیب ہمہ در تیغ سر باز کنند

تھا ملک حبش کا ایک سلطاں — نامی تھا دلیر تھا وہ ذیشاں
تلوار کا بخت کا دھنی تھا — ملک و زر و قوم سے غنی تھا
یکتائے زماں دلاوری میں — دریا دل تھا بہادری میں
تھی فوج کے اُس کی یوں روانی — جیسے بہتا ہوا ہو پانی
طوفان کی طرح جدھر کو آیا — بستی کو صاف کر دکھایا
موجوں کی طرح جو فوج آئے — ندی اک خون کی بہائے
چن چن کے سرکشوں کو مارا — تلوار کے گھاٹ اُنہیں اُتارا
پل لاشوں سے آن میں بنایا — جو منہ سے کہا وہ کر دکھایا
ہے شکل حباب زندگانی — دنیا ہے بے ثبات و فانی
پیغامِ اجل جو اُس کو آیا — فرزند نے تاج و تخت پایا
بچپن میں یہ آرزو بر آئی — شاہی فضلِ خدا سے پائی
والد کا اُٹھا جو سر سے سایا — اللہ نے حکمراں بنایا
دن رات تھا عیش کا ترانا — طبلہ کی تھاپ ناچ گانا
کہنا نہ کسی کا اُس نے مانا — لٹنے لگا مفت کا خزانا
دربار سے کچھ غرض نہ کچھ کام — عشرت میں تھی صبح عیش میں شام
مرضی کے خلاف جس کو پایا — اُس کا سر تیغ سے اُڑایا
ضد کے باعث پھرا زمانہ — بیگانہ ہوا ہر اک یگانہ
مخلوقِ خدا بھی سب پریشاں — حیران گریہ کناں و نالاں
کہنے سننے پہ بس یقیں تھا — جو کہہ دیا جس نے دل نشیں تھا
توفیق نیک اُسے خدا دے — تحقیق سے پہلے جو سزا دے

خلقت میں بے محل تھا غصہ — تھا آگ کا جزو کچھ زیادہ
صحبت بھی ہمسنوں کی دن رات — کرتا نہ تھا وہ وزیر سے بات
پروا کچھ نہ فوج کی نہ زر کی — تھی اُس کو خبر نہ اپنے گھر کی
دن رات تھا بس شراب سے کام — پریوں میں بنا ہوا تھا گلفام
عہدِ اول کا یہ بیاں ہے — آخر کی عجیب داستاں ہے
عاقل تھا وزیر جو پرانا — دیکھے ہوئے تھا وہ اک زمانہ
خاموش تھا اپنی جا پہ وہ پیر — رہتا تھا رات دن وہ دلگیر
آیا سیاح اک قضا را — دیوان نے اپنے گھر اُتارا
آیا جب وہ وزیر کے گھر — دیکھا اُس کو بحالِ مضطر
رنج و افسوس میں جو پایا — قصہ دلچسپ اک سنایا
پھر زاغ و ہما کی حکمرانی — دلچسپ سنائی اک کہانی
بولا یہ وزیر پاس آؤ — کچھ تجربہ اپنا تو سناؤ
اُس نے کی عرض جو ہو فرصت — سن لیجئے کچھ مری نصیحت
عاقل نے کہا کہو بصد شوق — مشتاق ہے دل مرا بصد ذوق
بولا سیاح مردِ عاقل — دشمن سے رہے کبھی نہ غافل
سچے دل سے جو مہرباں ہو — ہو جائے فدا جو قدرداں ہو
اس میں ہے ہر طرح کی ذلت — مغرور کو ہے عبث نصیحت
وہ دوست نہ جس میں کچھ وفا ہو — الفت نہ ہو مکر ہو دغا ہو
وہ شخص کہ جس میں خود سری ہو — وہ امن نہ جس میں کچھ خوشی ہو
وہ قول جو فعل سے جدا ہو — وہ جھوٹ نہ جس کی انتہا ہو

جس میں اوصاف سب پاؤ — اُس کی صحبت ہاتھ اٹھاؤ
اُن سب سے کرو صد اکنارا — عاقل کو بس ہے یہ اشارا
حرام میں ہو بخیر نیت — لازم ہے بشر میں آدمیت
جس مال میں ہو نہ خیر و برکت — قاروں کی طرح وہ ہے جا غارت
بس ختم کیا کلام اُس نے — پیدا کیا سب میں نام اُس نے

عاقل نے دیا خوشی سے انعام — ٹھہرایا اُسے یہ عیش و آرام
تشریح طلب ہیں سب مقولات — قصہ ہے ایک ایک ہر بات
جس کے دل میں یہ خیال آئے — کرکے تشریح وہ بتائے
فرصت نہیں اس لئے ہوں مجبور — خود ہی ہے اختصار منظور
کر حق سے دعا عدیلِ ناکام — اللہ کرے بخیر انجام

عدیل بلگرامی

رات کے پچھلے پہر طاؤس کی پکار

محبت لالہ و گل کی جو تھی دل میں وہ کام آئی
پرِ طاؤس پر آخر وہی نقش و نگار آیا

ہائے کیا آواز تھی کیسی تھی یہ پیاری صدا
جس نے مجکو خواب سے چونکا دیا۔ تڑپا دیا
اُس کے نغمے صبحگاہی بھی نہ جی بھر کر سُنے
لے اڑا فوراً نسیم صبح کا جھونکا اُسے
نیند کا ماتا نہ سمجھا میں کہ کیا آواز تھی
نغمۂ جاں سوزِ مطرب یا صدائے ساز تھی
کونسا طائر الٰہی یہ ترنم ریز تھا
جس کا نغمہ ایسا حسرت خیز درد انگیز تھا
اے نسیمِ روح پرور تو ہے غمازِ چمن
تو ہی کہدیتی ہے ہم سے آکے سب رازِ چمن
ساز کے مانند ہیں تجھ میں صدائیں بے شمار
تار کی صورت تری موجوں میں ہیں نغمے ہزار

پھر میں سننا چاہتا ہوں وہ نوائے دلفریب
پھر ذرا پہنچا دے مجھ تک وہ صدائے دلفریب
شرق کی جانب سے آئی پھر ہوا مستانہ دار
اور وہی ہمراہ اپنے لیکے صوتِ خوشگوار
ہائے یہ آواز ہے طاؤسِ رقصاں کی پکار
جس کو سنتے ہی مرا دل ہو گیا پھر بیقرار
سن لیا ہے جب سے میرے لب پہ آہ سرد ہے
ہائے اس آواز میں کیا لوچ ہے کیا درد ہے
میرے پیارے مور بتلا کس لئے نالاں ہے تو
ہائے تجھ پر کیا بنی ہے کس لئے گریاں ہے تو

بس کرتے کرتے کیوں ہو کر حزیں روتا ہے تو
آنسوؤں سے اپنا منہ کس واسطے دھوتا ہے تو
داغ ہیں کیا دل میں بھی تیرے ذرا بتلا دے مجھے
کیوں یہ کیسی آہ و زاری ہے ہوا کیا ہے تجھے
صبح ہونے میں ابھی کچھ دیر ہے اے بیقرار
چاند ابھی ڈوبا نہیں تارے ابھی ہیں آشکار
نیند میں ہیں بلبلیں اور خواب نوشیں میں گلاب
سرو پر قمری ہے آموں پر ہے کوئل محوِ خواب
سو رہے ہیں سب کے سب غفلت میں ہے سارا جہاں
دیتی پھرتی ہے نسیم صبح سب کو لوریاں
پر تجھے یہ کیا ہوا ہے ہو گیا بیدار کیوں
سب تو ہیں آسودہ راحت سے ہے تو بیزار کیوں
ہاں میں سمجھا کس نے سوتے سے جگایا ہے تجھے
ہائے شاید دردِ الفت نے ستایا ہے تجھے
آہ کرکے رو رہا ہے کیا اسی کی یاد میں
جس نے یہ تاثیر بھر دی ہے تری فریاد میں
ہے اگر ایسا تو سب عشاق میں اول ہے تو
سب پرندوں میں ہے افضل عشق میں اکمل ہے تو

میر سعادت حسین نجیب

ہے قناعت کی بدولت مجھے دولت حاصل
زندگی راحت و آرام سے ہوتی ہے بسر
نہیں پھیلاتا ہوں میں ہاتھ کسی کے آگے
پاؤں پھیلاتا ہوں اتنا ہی ہو جتنی چادر
[illegible] کے چٹکنے سے یہ آتی ہے صدا
ہے وہ کافی مری مٹھی میں ہے تھوڑا سا جو زر
[illegible] کی طرح سے ہوں باغ جہاں میں آزاد
میں سبکبار ہوں کچھ بار نہیں ہے مجھ پر
[illegible] گیا علم قناعت سے مرے دل پہ یہ راز
خاک اکسیر ہے اور لعل و گہر ہیں پتھر
[illegible] ہوتا ہے سدا [illegible]
قطرۂ آب بھی ہے میری نظر میں گوہر
جب سے ہے قاف قناعت پہ تسلط مجھکو
نہیں کرتا میں کبھی ملکِ سلیماں پہ نظر
نہیں رکھتا ہوں ضرورت سے زیادہ زر و مال
راہزن کا ہے مجھے خوف نہ ہے چور کا ڈر
رات کو چین سے بستر پہ ہوں سویا کرتا
دن کو آرام سے رہتا ہوں میں بے خوف و خطر
میں نے چاہا نہ کسی کا بھی زوالِ نعمت
نہ کبھی رشک و حسد مجھکو ہوا [illegible]
نہ کبھی اپنی بڑائی کا مجھے آیا خیال
کی کسی پر نہ کبھی میں نے حقارت سے نظر

نہ کبھی مال کی قلت سے ہوا میں غمگین
نہ زیادہ کی تمنا میں ہوا میں مضطر

گر ملا مجھکو زیادہ تو کیا شکر خدا
کم جو پایا تو ہوئی صبر و قناعت میں بسر

اُمرا اوڑھ لیں اس کو تو پسینہ آجائے
میرا کمل ہے دو شالے سے کہیں بڑھ چڑھ کر

پا کے دنیا کا زر و مال بھی مفلس ہے حریص
مرد قانع ہے غنی گو کہ نہ ہو دولت و زر

لے گیا کچھ بھی نہ حسرت کے سوا اپنے ساتھ
ہاتھ خالی ہی زمانہ سے اُٹھا اسکندر

چشم عبرت سے جہاں میں ہوں میں ناظر ہوش
اس کے انجام پہ ہر دم مری رہتی ہے نظر

ایڈیٹر

جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

کبکے بچھتا سے ہم آنکھوں میں ٹھہرنے کے لئے
پاؤں پھیلاتے ہیں اب دل میں اُترنے کیلئے

آنکھیں ساقی کی سلامت مرے دشمن ترسیں
دھرے میخانے ہیں نیت مری بھرنے کیلئے

کس مسیحا کی ہے مقتل میں الٰہی آمد
موت بھی آج تری جاتی ہے مرنے کیلئے

اُس کی پلکیں ہیں غضب اس کی نگاہیں آفت
کتنے نشتر ہیں رگِ جاں میں اُترنے کیلئے

کھینچکر شکل مری دنگ ہے نقاشِ ازل
رنگ ملتا نہیں تصویر میں بھرنے کے لئے

پھوٹ کر روئے ہم اشکوں کی پریشانی پر
کیا خبر تھی کہ یہ موتی ہیں بکھرنے کے لئے

شوخیوں سے نگہِ ناز کہیں رکتی ہے
چلتے جادو سے کہے کون ٹھہرنے کے لئے

میرے مرنے کی خوشی کیوں ہے قیامت ہے قریب
زندہ ہو جاؤں گا پھر آپ پہ مرنے کے لئے

کوئی بن ٹھن کے اٹھا ہے مرے گھر آنے کو
بگڑے بیٹھے ہیں نصیب آج سنورنے کے لئے

دل میں آنے کی جو سوجھی لگے اڑنے مجھ سے
وہ پری بن گئے شیشے میں اُترنے کے لئے

قیس و فرہاد کے بعد آپ غنیمت ہیں جلیل
جیتے جی یار پہ سو جان سے مرنے کے لئے

مولوی لطیف احمد صاحب اختر مینائی

اُن کے خرامِ ناز کا چرچا ابھی سے ہے
محشر دو سالہ جو برپا ابھی سے ہے

چھوٹے سے قد پہ چال قیامت کی پائی ہے
عمرِ دراز باد وہ فتنا ابھی سے ہے

ہاتھ اُس نے دل پہ چاہ سے رکھا نہیں ابھی
سینے میں ہاتھ بھر کا کلیجا ابھی سے ہے

تلوار لی نہیں مرے قاتل نے میان سے
میری حیات و موت میں جھگڑا ابھی سے ہے

کمبخت دن بھی ہجر کا اب تک ڈھلا نہیں
صبح شبِ وصال کا دھڑکا ابھی سے ہے

صیاد دام لیکے جب آئے گا آئے گا
میرے گلے میں عشق کا پھندا ابھی سے ہے

آنکھیں تمہاری قہر کریں گی شباب میں
چتون تو دیکھو دل کا تقاضا ابھی سے ہے

پایا تھا نام لیلی و مجنوں نے بعدِ مرگ
میرے تمہارے عشق کا چرچا ابھی سے ہے

گو ابتدائے عشق ہے لیکن زہے نصیب
اختر کسی کی آنکھ کا تارا ابھی سے ہے

مولوی سید نوازش علی صاحب لمعہ

دیکھے تو کوئی حوصلہ اربابِ وفا کا
خود اُس کو سکھا دیتے ہیں انداز جفا کا

کیا اُس بُتِ کافر کو سزا ملتی ہے دیکھیں
سنتے تو ہیں ہم نام بہت روزِ جزا کا

باقی نہ زلیخا نے رکھا آنکھ کا پردہ
پیوند ہو گیا حضرتِ یوسف کی قبا کا

راہ و روش دھر سے واقف میں نہیں ہوں
رہزن پہ بھی دھوکا ہے مجھے راہ نما کا

اللہ کرے خیر ہے ہر وقت اشارہ
غمزے کو کرشمے کا کرشمے کو ادا کا

خاتم کوئی پہنے تو سلیماں نہیں ہوتا
موسیٰ نہیں ہوتا ہے جو مالک ہو عصا کا

کیا پوچھنے آئے ہو مرا حال سد ھارو
جیتا ہوں بہر حال مرا احسان خدا کا

الٹے وہ پھرے ہیں مرے دروازے تک آ کر
انداز کہے دیتا ہے نقشِ کفِ پا کا

مانا کہ نہ تھا میں کرم و رحم کے قابل
اتنا تو سمجھنا تھا کہ بندہ ہے خدا کا

اے لمعہ گناہوں کو میں ڈھانکوں گا اسی سے
دامن ہے مرے ہاتھ میں اب آلِ عبا کا

مرزا فدا علی صاحب خنجر لکھنوی

دِل جاتا ہے تو جائے دِل جانے کو کیا کہیے
وہ خوش ہیں تو سب کچھ ہے غم کھانے کو کیا کہیے

اظہارِ محبت پر یوں ہنس کے کہا اُس نے
دیوانہ ہے بکتا ہے دیوانہ کو کیا کہیے

کچھ یاد ہے وہ شوخی جب دِل مرا چھینا تھا
اب بیٹھ کے پہلو میں شرمانے کو کیا کہیے

ہم تشنہ لب آئے تھے تشنہ ہی چلے ساقی
اس جام کو کیا کہئے میخانے کو کیا کہئے
اس حسن کی گرمی سے اس سوز محبت سے
خود شمع جلی شب بھر پروانے کو کیا کہئے
کچھ حسن کے جھگڑے ہیں کچھ عشق کے قصے ہیں
عالم ہے جوانی کا دل آنے کو کیا کہئے
اب ذکرِ جفا کرکے دل ان کا دکھانا ہے
گزری ہوئی باتیں ہیں افسانے کو کیا کہئے
تو دل کے تعلق سے واقف ہی نہیں ناصح
اے مشفق من تیرے سمجھانے کو کیا کہئے
اک بوند نہیں دل میں خون آنکھوں سے کیا برسے
پیمانہ تو پیمانہ میخانے کو کیا کہئے
اب چھپ کے بتوں سے تم بیٹھو گے کہاں حسرت
کعبہ بھی ہے گھر ان کا بتخانے کو کیا کہئے

مرزا محمد بہادر صاحب رضا وکیل ہائیکورٹ

ضعف سے لب پہ نہ اک حرفِ تمنا پہنچا
ہائے کس وقت میں بالیں پہ مسیحا پہنچا
سارے عالم میں ترے حسن کا چرچا پہنچا
ذکر تیرا ہی سنا خلق میں جس جا پہنچا
ہو اگر صبر تو ہو جاتے ہیں پیدا اسباب
پیاس ساحل کی بجھا دینے کو دریا پہنچا
کیوں نہ ہیں دل میں جگہ تیر کو دیتا ناصح
کس کی چٹکی سے یہ چھوٹا تھا کہاں آ پہنچا
چاند جس طرح سے آئینہ میں ہو عکس فگن

دل میں اس طرح خیالِ رخِ زیبا پہنچا
رات بھر بزم میں ہنگامہ تھا پروانوں کا
شمع جب گل ہوئی پھر ایک نہ شیدا پہنچا
ابھی آنکھوں ہی میں تھا خواب جوانی کا خیال
صبح پیری ہوئی پیغامِ قضا آ پہنچا
جب ملا حسن کو اورنگِ شہی روزِ نخست
دل کو ہاتھوں پہ لئے نذر کو میں جا پہنچا
دادخواہوں کے اڑے ہوش اسی دیکھتے ہی
ہمہمہ ہو گیا محشر میں کہ وہ آ پہنچا
پہنچیاں تو نے پنہائی تو ہیں او مشاطہ
کہیں دکھ جائے نہ اس شوخ کا پیارا پہنچا
عشق مجنوں سے ہوا فاش جہاں میں ہر چند
دور تک تذکرۂ پردۂ لیلیٰ پہنچا
دیکھکر ان کو ہوا محو میں ایسا واللہ
میرے لب تک نہ کوئی حرفِ تمنا پہنچا

مرزا الطاف حسین صاحب لطف

ساقی و محتسب میں اگر ساز باز ہو
پھر آدھی رات کو در میخانہ نہ باز ہو
بندے ہیں ہم کرم کے نہیں جاہ سے غرض
محمود ہو جہاں میں کوئی یا ایاز ہو
رندِ سیاہ کار کا مسجد میں کام کیا
میخانہ میں جنازہ کی میرے نماز ہو
پھر کچھ نہیں ہے خوف جو ہو ناخدا خدا
طوفاں میں لاکھ زیست کا اپنے جہاز ہو

دولت لگے جو ہاتھ قناعت کے دھر میں — پست و بلند دھر کا مطلب یہی ہے لطف
منعم کو زر کی بھر نہ کبھی حرص و آز ہو — ہو سرنگوں کوئی تو کوئی سر فراز ہو

(۱) بدیہہ گوئی کا رسالہ نہایت دلچسپ ہے اور مولوی طباطبائی صاحب کا دیباچہ نہایت مفید مجھے یقین ہے کہ لٹریری مذاق کے لوگوں میں مقبول ہو گا کاش اس قدر مختصر نہ ہوتا۔

(ڈاکٹر محمد اقبال۔ لاہور)

کتاب کا بوٹا سا قد ہندوستانی مذاق ہے ہم خالص عربوں کی طرح بے میل تو ہے نہیں۔ ہندی ہونا کوئی وصف نہیں عجمی مذاق کشیدہ قامتی چاہتا ہے اس کے لئے آپ کو ذرا پھیلنا پڑے گا۔ اس کا موقع دوسرے اڈیشن میں باقی رہتا ہے۔

مہدی حسن (افادی الاقتصادی)

(۲) میری مزید بچانس کے لئے آپ کے عنایت کردہ "لقمۂ ماہی" (بدیہہ گوئی) کا دلی شکریہ لیکن جس طرح اونچے حلقوں میں کھانے کی میز پر برف (آئس کریم) دو چار چمچوں سے زیادہ لینے کا دستور نہیں یعنی جی چاہے بھی تو شائستگی کا اقتضاء یہ ہے کہ "دوہرانے" کا خیال نہ آئے مجھے اقرار کرنا پڑتا ہے کہ آپ کی کتاب سے میری سیری نہیں ہوئی یعنی لطافت کے ساتھ مقدار موجودہ کافی نہیں۔

اردو لٹریچر میں آپ کی جدت پسند طبیعت کی طرف سے یہ ایک نیا عنوان ہے جس کی تحت میں بذلہ سنجی لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی وغیرہ کے شواہد کثرت سے ملیں گے جس سے شگفتہ طور پر آپ کے دلچسپ موضوع تحریر کا رقبہ بڑھ جائیگا

(۳) بدیہہ گوئی اردو میں بالکل نیا اور قابل قدر رسالہ ہے اس موضوع پر کوئی کتاب علیحدہ نہ تھی اور کوئی وجہ بھی کہ شاعروں کی اس خداداد قابلیت کو خاص شان کیساتھ مستقل حیثیت سے پیش نہ کیا جائے یہ اضافہ نہایت دلچسپ اور مفید ہے۔ آپ نے جس خوبی اور سلیقے کے ساتھ ترتیب دی ہے اس کا اعتراف ہر ذوق سلیم پر واجب ہے۔

حامد حسن قادری (اڈیٹر شعیب کانپور)

(۴) ادبیات کی ایک صنف مخصوص جسے فرنچ و انگریزی میں ([illegible]) کہتے ہیں وہ ہوتی ہے جس کا مقصود تمام تر ادبی چاشنی ہوتی ہے۔ شعراء و اہل ادب کے لطائف و ظرا

فکاہات و مطایبات و دلچسپ حکایات سب اس عنوان کے تحت میں آتے ہیں

سید ناظر الحسن صاحب ہوش ایڈیٹر ذخیرہ نے بدیہہ گوئی کے نام سے اس فن سے متعلق ایک مختصر کتاب شایع کی ہے جس میں بدیہہ گو شعراء کا اُردو فارسی عربی کلام مع اُن کے مطالب کی توضیح اور ان کے "شانِ نزول" یعنی ان کے موقع و محل کی تصریح کے شایع کیا ہے - ابتدا میں مولانا علی حیدر طباطبائی کا ایک محققانہ دیباچہ بھی شامل ہے -

کتاب کا موضوع بجائے خود نہایت دلچسپ ہے اس لئے کتاب بھی قدرتی طور پر دلچسپ ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ شروع سے آخر تک دلچسپیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ ہے فارسی و عربی کلام کی اردو میں شرح بھی کر دی گئی ہے جس سے محض اردو خوان بھی کتاب کے لطف سے مستفید ہو سکتے ہیں

لیکن عام تذکروں کے مندرج واقعات کو نقل کر دینے سے یہ بہتر ہوگا کہ معاصر شعرا کے جو حالات اب تک دایرۂ تحریر میں نہیں آئے ہیں انہیں قلم بند کیا جائے - اس سلسلہ میں آغاز عنوان میر اکبر حسین صاحب سے کرنا چاہئے - جن کے کلام کا بیشتر حصہ بدیہہ گوئی کی بہترین مثال ہے یہ کتاب ہمارے سرمایۂ ادب میں ایک پُر لطف اضافہ ہے

عبد الماجد (بی اے)

---

(۵) میں نہایت ممنون ہونگا آپ نے اپنی دلچسپ اور سبق آموز کتاب "بدیہہ گوئی" کی ایک جلد بھیجکر مجھے اس کے مطالعہ کا موقع دیا -

میں نے کتاب کو اول سے آخر تک نہایت شوق سے پڑھا فی الواقع آپ نے اس مبحث کے لطائف و ظرائف کو نہایت خوش اسلوبی سے یکجا کر دیا ہے اور کتاب بہ ہیئت مجموعی اتنی دلچسپ ہے کہ ختم کئے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا - افسوس یہ ہے کہ شعرائے اُردو کے واقعات نسبتاً کم ہیں جی چاہتا ہے کہ اس سے زیادہ ہوتے بہر کیف جو لوگ فارسی اور عربی کے ذوق شناس ہیں وہ تو دل سے اس مختصر مجموعہ کی قدر کریں گے - اردو دانوں کے لئے آپ نے ترجمہ کر دیا ہے بلا شبہ وہ بہت اچھا ہے مگر اصل میں جو لطف ہے وہ ترجمے میں ذرا پھیکا پڑ جاتا ہے - بہر حال کتاب بہت دلچسپ اور قابلِ قدر ہے -

امید کہ ابنائے وطن آپ کی ہمت افزائی کریں گے

مفتی محمد انوار الحق
(ایم اے ڈائرکٹر تعلیمات بھوپال)

---

(۶) عربی میں تاریخ سے کسی قدر فروتر اور عام قصص و حکایات سے بالاتر ایک فن ہے جو ادب و تاریخ کا جامع ہے اسی کو محاضرات کہتے ہیں اردو میں اسکی صحیح مثال موجود نہیں گو ادنیٰ درجہ کا اُردو میں جو تاریخی سرمایہ بڑھایا جا رہا ہے وہ اسی قسم میں داخل کرنے کے لائق ہے لیکن ان کے مولفین کو چونکہ اُن کو تاریخ کہنے کی تاکید ہے اس لئے ہم اس کو محاضرات کہنے پر اصرار نہیں کر سکتے -

ابھی حال میں جناب سید ناظر الحسن صاحب ہوش بلگرامی ایڈیٹر ذخیرہ حیدر آباد نے بدیہہ گوئی کے نام سے ایک رسالہ لکھا

جو اس فن کی صحیح مثال ہے۔ مولف نے عربی فارسی اور اردو مآخذوں سے شعراء کی بدیہہ گوئی کے نہایت دلچسپ واقعات جمع کئے ہیں ساتھ ساتھ شعراء کے مختصر تذکرے بھی لکھے ہیں۔ طرز بیان سہل زبان صاف اور واقعات شائستہ ہیں۔

سید سلیمان ندوی

مدیر رسالۂ معارف اعظم گڑھ

(۷) بدیہہ گوئی پہنچ گئی۔ ماشاء اللہ خوب کتاب لکھی ہے مجھے ایسی جگر کاویاں تہِ دل سے پسند ہیں۔ ہزاروں صفحات کی ورق گردانی سے یہ درشاہوار حاصل ہوئے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی سعی مشکور فرمائے۔

حکیم مظفر حسین اظہر دہلوی

(۸) ایک کام سے ذرا باہر چلا گیا تھا اس وجہ سے بدیہہ گوئی کے لئے شکریہ عرض کرنے میں تاخیر ہوئی۔ معاف فرمائیے گا انوکھی چیز ہے۔ کاش اردو شعراء کی بدیہہ گویوں کی مثالیں اور زیادہ ہوتیں۔ کتاب دلچسپ ہے۔ مگر میری ناچیز رائے میں ضرورت سے زیادہ مختصر ہے اردو میں ممکن تھا کہ زبانی روایتوں سے کچھ اچھی مثالیں مل جاتیں۔ بہرحال کتاب قابلِ دید ہے اور اس کے لئے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

پریم چند

(۹) یہ کتاب جناب سید ناظر الحسن صاحب ہوش بلگرامی کے ذوقِ سلیم کا نتیجہ ہے اس میں موصوف نے فی البدیہہ اشعار کی نہایت عمدہ اور دلچسپ مثالیں پیش کی ہیں۔ عربی، فارسی، و اردو شعراء کی بدیہہ گوئی کے متعلق نہایت دلچسپ واقعات جمع فرمائے ہیں کتاب اس قدر دلچسپ ہے کہ پڑھنا شروع کیجئے تو بغیر ختم کئے ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ قدما کے واقعات کے ساتھ ساتھ اس زمانہ کے مشہور ادیبوں و انشا پردازوں۔ مہاراجہ سر یمین السلطنت بہادر شاد و عالیجناب فخر قوم آنریبل نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین صاحب بلگرامی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ کی بدیہہ گوئی کے متعلق واقعات پیش کئے ہیں نواب حیدر یار جنگ بہادر نظم طباطبائی لکھنوی نے ایک معنی خیز مقدمہ بھی اس کتاب کے ساتھ شامل فرمایا ہے۔ جس میں بدیہہ گوئی کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مقدمہ میں یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ زبان اردو میں بدیہہ گوئی کی مثالیں اس لئے کم پائی جاتی ہیں کہ اردو والوں نے ہندوستان کے فطری و قدرتی اوزان کو ترک کر دیا اور عربی و فارسی شعرا کی تقلید کی موصوف کی رائے ہے کہ جب تک اوزان کو نہ بدلیں اردو میں بدیہہ گوئی نہیں ہو سکتی اگر یہ رائے صحیح تسلیم کیجائے تو اردو کے جن شعرا نے بدیہہ گوئی کے نمونے پیش کرکے اپنی جودت طبع و فکر رسا کا ثبوت دیا ہے وہ واقعی قابل قدر اور لائق ستائش ہیں اور اگر ہم ان کی غیر معمولی ذہانت کا اعتراف نہ کریں تو سخت ناانصافی ہوگی یہ کتاب چھوٹی تقطیع کے دو سو صفحات پر جلی حروف میں نہایت خوشنما طبع ہوئی ہے قیمت صرف ایک روپیہ ہے جو اس گرانی کاغذ کے زمانہ میں زیادہ نہیں ہے۔ ارباب مذاق سلیم کا فرض ہے کہ اس کتاب سے ضرور اپنے کتب خانہ کو زینت دیں۔

نذیر احمد (علیگ) (سابق مدیر اخبار مسلم) الہ آباد

[illegible]

کتاب	قیمت
بچوں کی پرورش مصنفہ علیا حضرت فرمانروائے بھوپال قیمت فی جلد	۳ ر
[illegible] الاطفال	۸ ر
[illegible] بیمار داری	۲ ر
[illegible] زوجین	۸ ر
[illegible] و جواب تندرستی	۶ ر
ہندوستانی گھروں میں تیمارداری	۶ ر
[illegible] ات	۳ ر
[illegible] رت	۳ ر
[illegible] الحیوان	۳ ر
تہذیب النسوان	۶ ر
[illegible] مرتبہ جے بخش صاحبہ مہتممہ مدرسہ سلطانیہ	[illegible]
[illegible] فطرت۔ مرتبہ مولوی محمد مہدی صاحب	۸ ر
انسان	۸ ر
ازواج الانبیاء۔ منشی محمد حسین صاحب محوی لکھنوی	[illegible]
[illegible] اکانمی۔ ہر چہار جلد مفتی محمد انوار الحق صاحب ایم اے	[illegible]
باغ [illegible]۔ سید محمد مصطفٰے صاحب بی۔ اے	[illegible]
[illegible] الاخلاق مصنفہ عبدالکریم صاحب (علیگ)	۲ ر
پہیلیاں۔ مصنفہ سید مخدوم عالم صاحب مارہروی	ا ر
آغوش مادر	ا ر

نوٹ ان سب کتابوں کی قیمت کلدار ہے اور محصول ڈاک

ذمہ خریدار ہوگا۔

تازہ تصانیف نیر السلطنت راجہ راجایان سرکشن پرشاد

مہاراجہ یمین السلطنت جی سی آئی ای شاد بالقابہم

رباعیات و قطعات شاد جو آرٹ پیپر پر نامی پریس کانپور میں چھپوائی گئی ہے

قیمت صرف (عہ) دین حسین۔ مجلد قیمت علاوہ محصول (۴ ر) [illegible]

ماتم حسین مرثیہ قیمت علاوہ محصول ۲ ر ایمان شاد فارسی ۴ ر [illegible]

المفرد المرکب

مولوی عبداللطیف خاں صاحب (منشی فاضل)

زبان فارسی کے وہ الفاظ جو بظاہر مفرد یا جامد معلوم ہوتے ہیں

مگر درحقیقت مرکب ہوتے ہیں اور باعتبار معنی انہیں اصل شئے کے ساتھ

عمدہ تعلق ہے صت۔ قیمت قسم اول ۱۲ ر قسم دوم ۸ ر علاوہ محصول ڈاک

زود پشیمان

جو ایک بالغ نظر فلسفی اور خوش فکر شاعر نے حال ہی میں لکھا ہے

اس کی ابتدا میں مولانا شرر۔ مرزا رسوا۔ مولانا سید سلیمان ندوی

اور مسٹر سجاد حیدر (یلدرم) کی تقریظیں ہیں جس سے کتاب کی قدر و قیمت

کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے قیمت صرف ۸ ر سکہ کلدار علاوہ محصول

تحفۂ سائنس

یعنی مجموعہ عام فہم علمی مضامین حصہ اول مصنفہ شیخ فیروز دین مراد

بی اے، ایم ایس سی پروفیسر علوم طبیعیات ایم اے او کالج علیگڈھ ہیں

مضامین ہیں ضخامت پونے چار سو صفحات مع ایک مبسوط فرہنگ مصطلحات

قیمت [illegible] مصنف سے علیگڈھ کے پتے سے طلب کیجئے۔

مجلد ذخیرہ خواتین بنام منیجر ذخیرہ اندرون [illegible] دروازہ [illegible]

رسائل عماد الملک

ہم اس امر کا نہایت خوشی سے اعلان کرتے ہیں کہ بزرگ قوم
فاضل اجل آنریبل نواب عماد الملک بہادر
مولوی سید حسین صاحب بلگرامی ۔ سی ۔ ایس ۔ آئی ۔ کے
مضامین جو کچھ دستیاب ہوگئے ہیں اُن کا مجموعہ ذخیرہ پریس
میں زیر طبع ہے جو عنقریب زیور اشاعت سے مزین ہو کر پبلک
کی دیرینہ آرزو پوری کرے گا

اس مجموعہ کے مطالعہ کرنے والوں پر ظاہر ہو جائے گا
کہ عبارت کی عام فہمی و بے تکلفی اور خیالات کی نفاست و
پاکیزگی کا خاص عنصر اس میں بدرجۂ اتم موجود ہے ایک ایک
مضمون پڑھا ہوا ہے جس کے مطالعہ سے ہر شخص کے معلومات میں
کثیر اضافہ ہونے کی پوری اُمید ہے۔

صفحات (۲۰۰) سے زائد ہوں گے اور نہایت عمدہ
کاغذ پر بہترین لکھائی چھپائی کے ساتھ طبع ہو کر ملک کے علم دوست
حضرات کی خدمت میں پیش کیا جائیگا قیمت (ہے) مع
محصول ڈاک مقرر ہے جو بزرگان قوم اس علمی مجلس میں حصہ
لینا چاہیں وہ اپنی خواہش کے مطابق ایک یا زیادہ نسخوں
کی فرمائش فرما کر اپنا نام درج رجسٹر کرا دیں ۔ تاکہ بعد تکمیل طبع
رسائل عماد الملک بذریعہ وی ۔ پی ۔ بھیجدیا جائے اور جو صاحب
چاہیں بذریعہ منی آرڈر قیمت بھیجکر طلب فرما سکتے ہیں ۔

منیجر رسالۂ ذخیرہ
حیدرآباد دکن

جواہر الاشعار

مؤلفہ مولوی سید نوازش علی صاحب

اس کتاب میں میر و مرزا سے لیکر غالب و ذوق تک
شعرائے دہلی کے اخلاقی اور حکمی دو ہزار سے زیادہ اشعار
جمع کئے گئے ہیں اس کتاب کی تالیف سے شعرا
کی اصلاح مقصود ہے جو اردو کی شاعری کو محض
مجموعہ تصور کرتے ہیں اس کے سوا مضمون نگاروں
اور مقرروں کو اپنی تقریر و تحریر میں برمحل اشعار
اور اس کو دلچسپ بنانے کے لئے اس کتاب سے
مواد مل سکتا ہے۔

ہر صاحب ذوق کے پاس اس کی ایک جلد
ضرور ہے قیمت محصول کے علاوہ صرف (۱)
ذخیرہ پریس سے یہ کتاب ملسکتی ہے

بدیہہ گوئی

مؤلفہ
سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی ایڈیٹر
زیور طبع سے آراستہ ہوگئی (۲۰۰) صفحہ کا حجم ہے چھوٹی
سائز ۔۔۔ ولایتی کاغذ پر نہایت اہتمام کے ساتھ چھپی
فارسی ۔ اردو ۔ کہنے والے شعرا کے مختصر حالات اور
جو انہوں نے وقتاً فوقتاً بدیہتہ کہے ہیں اس میں
پڑھکر لطف اٹھائیے قیمت بھی کچھ نہیں صرف ایک روپیہ
محصول ضرور لگائیے

ملنے کا پتہ منیجر رسالہ ذخیرہ حیدرآباد دکن

جلد ۱ نمبر ۲

مئی ۱۹۱۸ء

۱۳۴۳

ذخیرہ

ایڈیٹر سید مظاہر الحسن ہوش بلگرامی

فہرست مضامین

قیمت سالانہ (للعہ)

مندرجۂ ذیل خطبۂ صدارت جو مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی نے ندوۃ العلما کے سولھویں سالانہ جلسہ منعقدہ ماہ اپریل ۱۹۱۶ع بمقام مدراس کے لئے لکھا تھا اگرچہ آپ عین وقت پر علیل ہو جانیکے باعث مدراس جانے سے معذور رہے تھے لیکن خطبۂ صدارت چھپوا کر اجلاس میں تقسیم کرنے کے لئے بھیجدیا تھا۔

یہ فاضلانہ خطبہ ہندوستان میں تعلیمِ دینِ اسلام و علومِ عربیہ کی اشاعت کا حال ظاہر کرتا ہے اور تعلیم دین کے موجودہ زوال پر نظر ڈال کر اصلاح و ترقی کی مؤثر تدابیر بتاتا ہے۔ اس خطبہ کی خوبیوں کا اعتراف نواب عماد الملک بہادر ایسے ماہر فن اور شیفتہ تعلیم نے اپنے خطبۂ صدارت حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس میں فرمایا ہے اور فی الواقع اس خطبہ کے مفید و علمی مضامین تعمیم اشاعت کی ایک عرصہ سے سفارش کر رہے تھے حسن اتفاق کہ ایک روز نواب عماد الملک بہادر نے فرمایا کہ اس خطبہ کو ذخیرہ میں نقل کر دینا چاہئے تاکہ اس کے علمی مضامین سے ناظرین ذخیرہ بھی بہرہ اندوز ہوں۔ ہم نہایت مسرت کے ساتھ اس کو درج کرتے ہیں اور ناظرین سے بھی توقع کرینگے کہ وہ اس کی ایک ایک سطر کو بہ نظر تعمق ملاحظہ کریں اور دیکھیں کہ لکھنے کا ڈھنگ، طرز بیان کی خوش اسلوبی، اور بیان کی سادگی حالی و آزاد کو داد دینے کے لئے پکار رہی ہے۔

ایڈیٹر

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

حضرات علمائے کرام و معززین امت!

بغداد شریف کے مدرسہ نظامیہ کا جب سے عالم ... امام فخر الاسلام جب اول مرتبہ وہاں مسند درس پر بیٹھے تو انہیں وہ اکابر یاد آئے جن سے مسند مذکور زینت پا چکی تھی مثلاً شیخ ابو اسحاق شیرازی و امام غزالی۔ اس خیال سے امام ممدوح کے دل پر ایک چوٹ سی لگی آنکھوں پر عمامہ رکھکر بے اختیار رو دئے اور فرمایا ؎

خلت الدیار فسدت غیر مسود
ومن العناء تفردی بالسؤدد

زمانہ اہل کمال سے خالی ہوگیا تو مجھ سا بے مایہ سرگروہ بنا
مجھ سے آدمی کا سالار یگانہ بننا کیسا اندوہ افزا ہے

آج کا حسرت انگیز سماں اس مثال سے کس قدر مطابق ہے جو کرسی جناب استاذ العلماء مفتی محمد لطف اللہ صاحب مغفور اور مولانا احمد حسن صاحب مرحوم سے بزرگوں کی صدارت سے شرف حاصل کر چکی ہو اس پر ایک ایسے شخص کا بیٹھنا جو نہ عالم ہے نہ کسی علمی خاندان کا فرد فی الحقیقت حیرت خیز اور عبرت انگیز منظر ہے میں کبھی اس مقام پر قدم رکھنے کی جرأت نہ کرتا اگر میرے تحیر کو ایک میرے مخدوم یہ کہکر دور نہ فرما دیتے کہ "گُدر نا موت الکبراء" اس مشہور مقولہ نے مجھکو یہ اطمینان دلادیا کہ میرا کوئی شرف باعث انتخاب نہیں ہوا بلکہ بزرگان امت نے میری کم مائگی کو نظر قبول سے ملاحظہ فرمایا ہے اب یہ بے سروسامانی میرے واسطے سرمایۂ فخر ہے اور میں اپنی بے بضاعتی کے اعتراف و اقرار کیساتھ تعمیل ارشاد اور خدمت کے واسطے حاضر ہوں ؎

بنازم بہ بزم محبت کہ آنجا
گدائے بہ شاہے مقابل نشیند

بااین ہمہ سمجھتا ہوں کہ یہ شرف ایسا ہے جو تلافی عمر اور کارنامۂ زندگی مانا جا سکتا ہے پس جن بزرگوں نے یہ اعزاز عطا فرمایا ہے اُن کا شکریہ سارے دل بالابال ہے جزاھم اللہ عنی خیر الجزاء یہ عرض ... آپ کے کرم اور توجہ کے میں اس خدمت کا حق ادا کر سکوں گا۔

بزرگانِ قوم! مجلس ہٰذا کے مقاصد و اغراض کے اعتبار سے نیز اس لحاظ سے کہ زمانۂ حال میں عموماً مسلمانِ علوم عربیہ سے بے پروا نظر آتے ہیں مناسب ہوگا کہ میں اس موقع پر علوم عربیہ کی مختصر تاریخ عظمت اور وسعت بیان کردوں تاکہ معلوم ہو کہ کیسی شاندار امانت (جو اسلاف کی محنتوں کا نتیجہ اور حق و صداقت کا ذخیرہ ہے) ہمارے ہاتھوں میں ہے اور ہم کو کیسے بے مثال سرمایہ کی حفاظت و ترقی کا حق ادا کرنا ہے۔ کلام ربانی اور احادیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دینِ آلٰہی کے اہم مقاصد میں سے ایک مقصد علم کی ترویج و اشاعت بھی تھا۔ کلام مجید میں بار بار مختلف پیرایوں میں علم اور علما کی فضیلت بیان فرمائی ہے اور حصولِ علم کی تاکید۔ مثلاً چند آیتیں نقل کرتا ہوں

وَيَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ۔ اور بلند کرے گا اللہ تم میں سے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے ہیں اور اُن کے جو علم والے ہیں بہت سے درجے

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۔ جس کو حکمت دیدی گئی اُس کو بڑی بھاری دولت بخش دیگئی

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ۔ اللہ سے ڈرنیوالے صرف علما ہیں۔

خشیتہ آلٰہی جو ذریعہ ہے نجات اور اجر کریم اور ہدایت پانے کا اس کو گروہ علما میں حصر فرما دینا علما کی انتہائی شان پر دلالت کرتا ہے۔

سب سے زیادہ علمی ترقی کی محرک وہ آیتیں ہیں جن میں آیات ربانی ...

اور مظاہر قدرت پر غور و تدبر کی تاکید فرمائی گئی ہے اور یہ مظاہر قدرت اس قدر وسیع ہیں کہ طبیعیات، زرعیات، برقیات، فلکیات، ارضیات وغیرہ تمام علوم اُن کے لانہایت دائرہ میں آجاتے ہیں۔

ارباب تفسیر نے لکھا ہے کہ حضرت آدم کو ملائکہ کا سجدہ کرنا تعظیم علم کے سبب سے تھا نہ صرف حصول علم کی تاکید ہے بلکہ علم میں برابر ترقی کرنے کا حکم ہے چنانچہ حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دُعا تلقین فرمائی گئی:-

رب زدنی علما

یارب میرے علم کو بڑھا۔

حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کلام ربانی کی تائید اسی اہتمام سے فرمائی ارشاد ہے:-

العلم حیات الاسلام وعماد الدین۔	علم اسلام کی جان اور دین کا ستون ہے۔
العلم سلطان اللہ فی الارض فمن وقع فیہ فقد ہلک	علم زمین پر خدا کی قوت ہے جو اُس سے مقابل ہوا تباہ ہوا۔
العلم خلیل المومن والعقل دلیلہ۔	علم مومن کا دوست اور عقل رہنما ہے۔
العلماء مصابیح الارض وخلفاء الانبیاء وورثتی وورثۃ الانبیاء۔	علما زمین کی روشنی ہیں اور انبیا کے نائب اور میرے اور انبیا کے جانشین۔
وزن حبر العلماء بدم الشہداء فرجح علیہ۔	علما کی روشنائی شہدا کے خون سے وزن کی گئی تو اُسکا پلہ بھاری رہا۔
ما تصدق الناس بصدقۃ افضل من علم	علم پھیلانے سے بہتر کوئی صدقہ نہیں۔

یہ علم باعث بربادی ہے جس پر عمل نہ ہو۔

مثل العالم الذی یعلم الناس الخیر وینسی نفسہ کمثل السراج یضیئ للناس ویحرق نفسہ۔	جو عالم اوروں کو نیکی سکھائے اور خود اپنے نفس کو بھول جائے وہ مثل چراغ کے ہے جو لوگوں کو روشنی کرا اپنے آپ کو خاک سیاہ کر دیتا ہے
اشد الناس عذابا یوم القیامۃ عالم لم ینفعہ علمہ	جس عالم کو اس کا علم نفع نہ پہنچائے اُس کو قیامت میں سب سے زیادہ شدید عذاب ہوگا۔
علم لا ینفعہ کالکنز لا ینفق بہ۔	علم غیر نافع ایسا خزانہ ہے جو صرف نہ کیا جائے۔

علاوہ قولی تاکید کے عملاً بھی علم و علما کی شان و فضیلت کا اظہار فرمایا ہے چنانچہ ایک مرتبہ مسجد میں حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ وہاں دو حلقے تھے ایک میں کچھ آدمی خدائے تعالیٰ سے دعا مانگ رہے تھے دوسرے میں درس و تدریس جاری تھی آپ نے ارشاد فرمایا:-

انما بعثت معلما

میں تو تعلیم دینے آیا ہوں۔

یہ فرماکر درس و تدریس کے حلقہ میں تشریف فرما ہوگئے۔ اس پاک تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ صحابۂ کرام میں علم کا ذوق سرایت کر گیا اور وہ فدائی گروہ علوم کی ترویج پر کمربستہ ہوگیا۔

سب سے اول کلام الٰہی اور حدیث و فقہ کی حفاظت و اشاعت پر توجہ فرمائی اُس سعی کا یہ نتیجہ ہے کہ صدہا برس گزر جانے پر بھی علم کے یہ دونو سرچشمے تحریف و تصحیف کے گرد و غبار سے پاک اور صاف اپنے فیض سے عالم کو سیراب کر رہے ہیں۔ علاوہ دینی علوم کے دوسرے علوم کی خدمت کی بنیاد مسلمانوں میں خود صحابۂ کرام کے زمانہ میں پڑ چکی تھی۔ باب مدینۃ العلم حضرت علی مرتضیٰ

علوم عربیہ کا کبھی کچھ چرچا رہا ہو بعید از قیاس سا معلوم ہوتا ہے لیکن نہیں
علوم عربیہ کے تعلیم بھی پوری طرح ہو یا ہو چکا ہے ابن بطوطہ
جب آٹھویں صدی ہجری میں پہلے اس خطہ میں آیا تو سواحل ملابار کو
علم عربی اور علماء سے معمور پایا وہ اپنے سفرنامہ میں قالقوط -
(کالیکٹ) ہنور، منجرور (منگلور) جرفتن وغیرہ اس زمانے
کے تمام مشہور مقامات کا ذکر کرتا ہے ساتھ ساتھ ہر جگہ کے علماء
عربی کا اور مدرسوں کا تذکرہ کرتا ہے قالقوط کی نسبت کہتا ہے
یہاں امیر التجار ابراہیم شاہ بندر ہے جو ایک بحرین کا فاضل ہے
قاضی یہاں فخر الدین عثمان ہیں اور صاحب خانقاہ شیخ شہاب الدین
گازرونی منجرور (منگلور) کی نسبت لکھتا ہے یہاں کے قاضی ایک
فاضل کریم شافعی ہیں جن کا نام بدر الدین ہے ان کے یہاں مجلس
درس گرم رہتی ہے بندر ہیلی کی نسبت لکھا ہے یہاں کی مسجد ہندو
مسلمان دونوں کے نزدیک محترم و واجب التعظیم ہے تجار کثرت سے
اس میں روپیہ بھیجتے ہیں جس کی وجہ سے مسجد کا خزانہ معمور ہے
طلبہ کی ایک جماعت اس میں ہے جن کو وظائف ملتے ہیں -
لطف یہ ہے کہ یہ تمام مقامات خاص ہندو راجاؤں کے
قبضے میں تھے مسلمانوں کے مفتوحہ نہ تھے - آخر زمانہ میں شہر
مدراس دار العلم بنا بارھویں صدی ہجری میں قاضی ابو بکر
شافعی قاضی مدراس تھے اس سلسلے میں سب سے بڑا شرف
اس شہر کو مولنا بحر العلوم کے قدوم سے حاصل ہوا جس طرح مدراس
کا بندر سمندر کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے اسی طرح شہر مدراس
کو یہ شرف حاصل ہے کہ علوم کے سمندر مولانا بحر العلوم اس کی آغوش
میں آرام فرما ہیں مولانا بحر العلوم نے ان ممالک میں فیض علمی کے دریا
بہا دیئے ملا علاء الدین، ملا جمال الدین، مولانا عبد الواجد اور
بہت سے بزرگ اس فیض کے یادگار تھے آخری یادگار [illegible]

حضرت شاہ عبد اللطیف صاحب ویلوری تھے جن کی ذات سے
ویلور کی مشہور خانقاہ مشرف تھی ہندوستان میں کثرت علماء
کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہمارے محترم ناظم نے جو تاریخ
ہندوستان کے علماء کی لکھی ہے وہ دس جلدوں میں ہے اور
پانچ ہزار سے زیادہ مشہور علماء کا اس میں ذکر ہے - اس قدر
بیان سے آپ یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ علوم عربیہ نے عالم
کو کس قوت و وسعت کے ساتھ اپنے انوار سے روشن کیا
علوم عربیہ کی تاثیر قوت اس سے ثابت ہوتی ہے کہ جس قوم
اور ملک میں پہنچے وہیں علم و کمال کی بنیاد جما دی - امام عکرمہ
حبشی - امام ابو حنیفہ فارسی - اور حکیم ابو نصر فارابی ترک تھے
علوم عربیہ کا اثر صرف مسلمانوں تک محدود نہیں رہا دوسرے
مذاہب کے پیرو بھی ان سے فیضیاب ہوتے رہے خلافت
اندلس اور حروب صلیبیہ کے سلسلے میں جب یورپ کی اقوام
کو مسلمانوں سے ملنے کا موقع ملا تو علمی شوق نے ان میں بھی
ایک تحریک پیدا کر دی ابو سینا اور ابن رشد کا فلسفہ صدیوں
تک یورپ کے درس میں شامل رہا - اندلس مدت تک اہل یورپ
کی تعلیم کا مرکز رہا انگریزی ہیئت کی کتابیں دیکھئے اصطلاحی الفاظ
ان کی عربیت پر صاف شہادت دیتے ہیں ہمارے ملکی بھائی
ہندوؤں نے ہمیشہ علوم عربیہ سے استفادہ کیا راجہ کندن لال
اشکی کی منتخب تنقیح الاخبار کتاب راجہ رتن سنگھ زخمی کی حدائق
النجوم اور رائے منوں لال فلسفی کی کتاب سدید الاستخراج
فن تقویم میں ان کے علم کی بہترین شاہد ہیں بنگال کے چودھری
[illegible] کا سنگ بنیاد [illegible] کے قابل [illegible]
سے رکھا گیا ہے یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے پٹنہ میں عربی کی
ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی گذشتہ موسم سرما میں کلکتہ کے ایک ہندو

بنگالی بابو صاحب نے مجھ سے کہا کہ اُن کے باپ اور چچا کے زمانے تک کلکتے سے بہ کثرت بنگالی عربی پڑھنے پٹنہ جایا کرتے تھے چنانچہ اُن کے چچا نے پندرہ برس میں علوم عربیہ کی تحصیل کی تھی اُس عہد کے ہندو مسلمانوں کے تعلقات و ربط کی یہ ایک سبق آموز مثال ہے کہ جناب مفتی محمد لطف اللہ صاحب مرحوم کے اُستاد فارسی منشی سوہن لال تھے اور مولانائے مغفور کے تلامذہ میں جے بہاری لال کایستھ تھے میں نے بچشم خود دیکھا کہ مولانا کے دوسرے رشید تلامذہ اُن کے ساتھ برادرانہ برتاؤ کرتے تھے۔

ہمارے علما کی شان ہمیشہ یہ رہی کہ اُنہوں نے علم کو علم کے لئے حاصل کیا علوم دین سے اُنھوں نے خدا اور اس کے رسول کی خوشنودی مقصود رکھی علوم دنیویہ جن کو بہت کم ذریعۂ جاہ و حشمت بنایا اُن کی خدمت بھی بہ حیثیت علم کرتے رہے یہ واقعہ مدین تاریخی کا زمانہ ہے کہ جب بغداد میں مدرسۂ نظامیہ قائم ہوا اور وہاں علما کے گراں قدر مشاہرے اور طلبہ کے لئے بیش قرار وظایف اور سامان آسایش اُن کے لئے مہیا کئے گئے تو علمائے بخارا نے علم کی مجلس ماتم منعقد کی اور رو کر کہا کہ اب علم علم کے لئے نہیں بلکہ جاہ و حشمت کے لئے حاصل کیا جائے گا اسی یکسوئی اور وحدت مقصود کا اثر تھا کہ ہمارا علمی گروہ تغیرات زمانہ سے بہت کم متاثر ہوا۔ اگلے زمانے میں جب امن و امان زیادہ اور زوال نہ تھی سلاطین کا انقلاب امرا کا عروج تنزل ملک میں تزلزل پیدا کرتا رہتا تھا۔ لیکن اس کا اثر ترقی علوم پر بہت کم ہوا۔ اس کی آخری مثال دہلی کے محدثین کا خاندان ہے مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے وقت جب گنگا جمنا خونریزی کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی اور تاج و تخت تاخت و

تاراج ہو رہا تھا۔ شاہ ولی اللہ صاحب کا خاندان انتہائی عزت و وقار کے ساتھ علم دین کی خدمت میں منہمک تھا اور اسی دور میں شاہ ولی اللہ صاحب کی ذات میں ایک ایسا حکیم الامت پیدا کیا جس کی مثال امام غزالی کے بعد مشکل سے مل سکتی ہے اور ایک اسی خاندان پر کیا حصر ہے۔ دہلی مرحوم کی آخری بہار نے کمال کے بہت سے گل سرسبد نمایاں کئے۔

اس بے تعلقی و یکسوئی کے ساتھ علوم عربیہ عملی دماغ اور کاروباری ذہن پیدا کرنے میں کبھی قاصر نہیں رہے ائمہ مجتہدین کی معاملہ فہمی پر فقہ کے مسائل زبردست گواہ ہیں جو آج بھی قانون کا بہترین سرمایہ خیال کئے جاتے ہیں جن بزرگوں نے خالص دنیاوی کاروبار کی جانب توجہ کی وہ کامیابی کی اعلیٰ منزل پر پہنچے۔ امام یحییٰ ابن اکثم امام حدیث ہیں۔ مامون الرشید کی تاریخ پڑھئے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس یادگار روزگار خلافت کے انتظام میں امام ممدوح کا کیا حصہ تھا، امام ابن ماکولا (علم الرجال کی بے مثل کتاب اکمال کی مصنف) جس طرح نامور امام حدیث تھے اسی طرح ایک کامیاب مدبر وزیر ابن ابی دواد نظام الملک طوسی صاحب ابن عباد وغیرہ وزرائے نامور کی ذات سے ایوان وزارت اور قصر علم دونوں یکساں زینت کے ساتھ مزین تھے۔ ہندوستان کی تاریخ میں عہد اکبری سلطنت کے اعلیٰ نظم و نسق اور مشکل مسائل کے حل کے لحاظ سے ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اُمرائے اکبری کے نورتن کی آب و تاب ابو الفضل فیضی پر ختم ہے اللہ شیرازی حکیم ہمام خان تھا ان کے دم سے تھی کیا اس کے یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ ان میں سے ہر ایک عربی مدرسوں میں بوریا نشین رہ چکا تھا اس دور آخر میں بھی جن دماغوں نے تعلیم جدید کا مسئلہ حل کیا وہ قدیم مدارس کے

اُن کی رونق باقی تھی۔

اس پست حالت کا احساس بعض اُن اہل دل کو ہوا جو علوم قدیمہ کے ساتھ ساتھ حالاتِ جدید کے احساس کی قابلیت دماغ میں اور تباہی ملت کا درد دل میں رکھتے تھے ان بزرگوں نے ۱۳۱۱ھ میں جس کو آج پچیس برس کا زمانہ گذرا اس مجلس عالی کی بنیاد ڈالی جن آنکھوں نے ندوۃ العلما کا پہلا اجلاس دیکھا ہے وہ تصدیق کرسکیں گے کہ وہ منظر سرزمین ہند میں اپنی آپ نظیر تھا۔ مختلف خیال وعقائد کے علما اس مقصد سے جمع ہوئے کہ نفسانیت او خصومت کو خدمتِ ملت کی خاطر علیحدہ رکھکر علوم عربیہ کی ترقی اور تباہ کن نزاعوں اور جھگڑوں کی بیخ کنی کی تدابیر پر غور کریں غالباً ہندوستان میں کوئی حصہ ملک اور فرقہ علما ایسا نہ تھا جسکے قائم مقام اس اجلاس میں کشادہ دلی اور وسعت خیال کے ساتھ شریک نہ ہوئے ہوں۔ ابتداءً ندوۃ العلماء کے دو مقصد تھے رفع نزاع باہمی اور نصاب تعلیم کی اصلاح۔ آج سے پچیس برس پہلے کے حالات او مدالتوں کے فرقوں کی اگر چھان بین کی جائے تو عیاں ہوسکتا ہے کہ مختلف فرقوں کی مذہبی جنگ و جدل کی اس وقت کیا حالت تھی ندوۃ العلما کا مقصود یہ تھا کہ مذہبی مباحثوں میں مناظرہ کی شان رہنی چاہئے مکابرہ اور مجادلہ تک نوبت نہ پہنچے ہر فرقہ کو مذہبی مباحثوں میں یہ امر ملحوظ رکھنا چاہئے کہ جو امر اُن کے نزدیک حق ہو اُس کو شان علم و تہذیب کا لحاظ رکھکر بیان کریں یہ نہ ہو کہ مباحث کی نوبت نفسانیت اور جدل تک پہنچ جائے جس سے اصل مقصود فوت ہو کر محض فتنہ و فساد باقی رہ جائے۔

خلاصہ یہ کہ اختلاف و نزاع کے اُس نازک فرق کو پیش نظر رکھنا چاہئے جو تابعی جلیل القدر یحیی بن سعید نے اِس مقولے میں متعین فرمادیا ہے اہل العلم اہل توسعة وما برح المفتون یختلفون فیحل ھذا ویحرم ھذا فلا یعیب ھذا علی ھذا یعنی علما اہل وسعت ہیں اور مفتی ہمیشہ باہم اختلاف کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ایک ایک چیز کو حلال بتاتا ہے دوسرا حرام لیکن ایک دوسرے کی عیب گیری نہیں کرتا حضرت امام جعفر صادق کا کس قدر پاکیزہ مقولہ ہے ایاکم والخصومة فی الدین فانھا تشغل القلب وتورث النفاق یعنی دین میں جھگڑنے سے بچو اس لئے کہ یہ جھگڑا دل کو (کام کی باتوں سے) باز رکھتا ہے اور نفاق پیدا کردیتا ہے۔ چونکہ یہ بحث بہت نازک ہے اس لئے اس موقع پر اس سے زیادہ بحث کرنا مناسب نہیں ہے ندوۃ العلما کی کوشش و سعی اس مقصد کے حاصل کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوئی اس کو اس بین فرق نے ثابت کردیا جو بعد کو مذہبی نزاعوں کی شدت میں نظر آیا دوسرے سالانہ اجلاس ندوۃ العلماء میں مشرقی اضلاع کے دو زبردست اور ذی اثر عالموں کی باہمی مصالحت ہمیشہ یادگار رہے گی اس مصالحت نے ہزاروں مسلمانوں کی تباہی کو روک دیا چند ہی روز کے بعد جب ندوۃ العلما کو خود ان نزاعوں کی زد میں آنا پڑا تو پورے ضبط واستقلال کے ساتھ اُس نے اپنے مقصد کو پیش نظر رکھا اور ایک سطر بھی اُس کی جانب سے ایسی نہیں لکھی گئی جو اس مقصد کی منافی ہوتی۔

اسی وسعت خیال کا نتیجہ وہ ربط وانبساط ہے جو ندوۃ العلما کی سعی سے علما اور جدید تعلیم یافتہ گروہ میں پیدا ہوا پٹنہ کا اجلاس ندوۃ العلما اس اعتبار سے ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ان دونوں گروہوں میں وہاں مصالحت ہوئی اُس موقع پر ہمارے مخدوم مولنا شاہ سلیمان صاحب نے اپنے مخصوص لہجہ میں اہل قیصر کا

یہ شعر اہل جلسہ کو سنایا تھا ؎

شکر شد کہ میان من و او صلح فتاد
حوریان رقص کنان ساغر و پیمانہ زدند

الحمد للہ کہ وہ صلح اب تک قائم ہے اور اس کے آثار اس اجلاس میں بھی نمایاں ہیں۔

دوسرا مقصد ندوۃ العلما کا عربی نصاب تعلیم کی اصلاح تھی۔ میں نے اوپر عرض کی ہے کہ ہندوستان میں علوم عربیہ مختلف ممالک سے آئے تھے قدرتی طور پر ان ملکوں میں جن علوم کا چرچا تھا وہی ہندوستان کے مختلف حصوں میں رائج ہوئے سندھ میں سلسلۂ علم خراسان اور ماوراءالنہر (ترکستان) سے آیا ان ممالک میں فقہ اور معقولات کو بہت ترقی تھی لہذا جب ملتان مرکز علم بنا تو وہاں کی درس تدریس میں ان علوم کا عنصر غالب تھا دو سو برس تک یعنی ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں نصاب تعلیم اسی رنگ میں رہا۔ اس عہد میں علم نحو، بلاغت، فقہ، تصوف، اور تفسیر معیار فضیلت خیال کئے جاتے تھے۔ حدیث ادب وغیرہ برائے نام پڑھائے جاتے تھے نویں صدی ہجری میں دارالعلوم ملتان کو زوال ہوا۔ یہاں سے علما ملک کے مختلف حصوں میں گئے ان بزرگوں میں مولنا عبداللہ تلمبنی نواح دہلی میں آئے اور ان کے شاگرد مولنا عزیزاللہ [illegible] یہ زمانہ سکندر لودی کی سلطنت کا تھا سلطان مذکور نے ان دونوں بزرگوں کی تشریف آوری ایک نعمت غیبی سمجھی اور ان کے واسطے درسگاہیں مہیا کیں اس کو ان کے درس سے اس قدر شوق تھا کہ کبھی کبھی مدرسہ میں آتا اور کسی گوشہ میں چھپکر ان کا درس [illegible] ان دونوں [illegible] نصاب تعلیم میں تغیر کیا مولنا عبداللہ تلمبنی [illegible] شارح تہذیب کے

شاگرد تھے اس لئے قدرۃً منطق کا پلہ زیادہ بھاری ہوا نیز علامہ تفتازانی اور میر سید شریف کی تصانیف شامل درس کی گئیں دسویں صدی ہجری کے آخر میں محقق دوانی صدر شیرازی اور میرزا جان شیرازی کے تصانیف ہندوستان میں پہنچکر داخل درس ہوئیں اور معقولات کی تعلیم کا دور دورہ پہلے سے بھی زیادہ ہوگیا۔ اس ترقی علمی میں نمایاں حصہ میر فتح اللہ شیرازی کا ہے جو اکبری نورتن میں تھے۔

اسی طبقۂ علما میں علامہ قطب الدین سہالی تھے جو علمائے فرنگی محل کے مورث ہیں اسی زمانہ میں بعض اہل علم ملک عرب تشریف لے گئے اور وہاں سے علم حدیث حاصل کرکے ہندوستان واپس آئے ان بزرگوں میں شیخ محمد طاہر صاحب مجمع البحار شیخ یعقوب کشمیری اور شیخ عبدالنبی گنگوہی قابل ذکر ہیں چونکہ گجرات میں علم ملک یمن سے بھی آیا تھا اس لئے وہاں علم حدیث کا درس جاری تھا ہندوستان سے کچھ علما گجرات گئے اور وہاں سے علم حدیث پڑھکر مراجعت کی غرض اس طرح دسویں صدی ہجری میں علم حدیث کو بھی ایک حد تک رواج ہوا (مگر معقولات میں علما اور طلبا کی محویت کی وجہ سے بہت کم ہوا) بالآخر شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی مساعی جمیلہ نے فیض کے دریا بہا دیئے اور ایک مخلوق کو علم حدیث سے بہرہ یاب کیا۔ بلحاظ نظام درس یہ تیسرا طبقۂ علما تھا۔

بارھویں صدی ہجری میں چوتھے طبقے کا آغاز ہوا استاذ الہند ملا نظام الدین صاحب نے نصاب تعلیم میں جدید تغیر کیا اور وہ نصاب مرتب فرمایا جو آج تک درس نظامی کے نام سے مشہور اور تمام مدارس میں کمی بیشی کے ساتھ رائج ہے۔ اس نصاب تعلیم سے زیادہ تر مقصود یہ تھا کہ اس سے طلبہ میں دقت نظر اور قوت مطالعہ

پیدا ہو۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ بوجہ احسن یہ مقصد درس نظامیہ سے حاصل ہوا۔ اسی دور میں دہلی میں شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم نے علم حدیث کی ترویج پر کمر ہمت باندھی اور ہمارے ملک کا بچہ بچہ اس سے واقف ہے کہ شاہ صاحب کی کوشش میں خداوند تعالیٰ نے برکت عظیم عطا فرمائی اور اس خاندان کی سعی سے ہندوستان دار الحدیث بن گیا ملا نظام الدین صاحب کے بعد درس نظامی میں کتب منطق کا اضافہ کثیر کیا گیا اور وہ کتابیں پڑھائی گئیں جو درس نظامیہ کے مدوین کے وقت تصنیف بھی نہ ہوئی تھیں مثلاً حاشیہ غلام یحییٰ، قاضی مبارک، حمد اللہ وغیر ذلک اس کے متعلق ایک عجب واقعہ ہے۔ شارحین سلم العلوم کے تلامذہ اپنے اپنے استادوں کے شروح پڑھتے پڑھاتے تھے اور ان میں باہم اس پر نزاع رہتا تھا کہ کس کی شرح بہتر ہے مدرسین جب اس سے تنگ آگئے تو انھوں نے سب شرحیں داخل درس کر دیں اس طرح سلم العلوم کے شروح و حواشی گویا تمام درس نظامی پر حاوی ہو گئے۔ (ان تمام معلومات کے لئے میں اپنے محترم حکیم سید عبد الحی صاحب ناظم ندوۃ العلماء کا ممنون ہوں)۔

مذکورۂ بالا بیان سے آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ کس طرح صدیوں تک منطق و حکمت کا اضافہ ہمارے عربی مدارس کے نصاب میں ہوتا رہا۔ ان فنون کی خالص کتابیں دہ کنار، قریباً تمام باقی علوم کی بھی وہی کتابیں داخل درس ہونے کے قابل سمجھی گئیں جو علوم معقول سے مالامال تھیں اور اس طرح اول سے آخر تک منطق کا سکہ مدارس عربیہ پر بیٹھا ہوا تھا ندوۃ العلماء جس وقت قائم ہوا اس وقت نظام درس کی یہ حالت تھی کہ طلباء کی عمر کا کثیر حصہ منطق کی تحصیل میں صرف ہوتا تھا (فن منطق کی تحصیل میں بھی اُن سنگ لاخ کتابوں کی تحصیل میں جو گو شامل منطق تھیں مگر اُن میں وہ مسائل تھے جن کو منطق کے مسائل نہیں کہہ سکتے مثلاً وجود علم وغیرہ کے متعلق مباحث) ادب عربی کی بہت سی معرکۃ الآراء کتابیں داخل درس تھیں اور طلبہ اُن کو نہایت جانفشانی سے پڑھتے تھے تاہم عربی عبارت لکھنے یا بولنے سے عاری رہتے تھے قرآن مجید کی خدمت بہت کم تھی یہ کھلا ہوا راز ہے کہ جو دماغ ذوق معقول میں ہر شار تھے وہ منقول کو اس نظر سے دیکھتے تھے کہ اس سے ذہن میں سطحیت پیدا ہوتی تھی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگلے اساتذہ کی طرز تعلیم اور صحبت کی برکت بہت کچھ نشہ معقول کے حق میں ترشی کا کام دیتی تھی اسی کے ساتھ ساتھ قریباً ہر درس گاہ عظیم کے ساتھ خانقاہ بھی لگی ہوتی تھی جو اخلاق کی صفائی اور باطن کی پیراستگی میں اکسیر کا حکم رکھتی تھی اور طلبہ مدرسوں سے فارغ ہو کر خانقاہوں سے فیض حاصل کرتے تھے۔

انقلاب زمانہ سے یہ سامان اصلاح تو مفقود ہو گئے منطقی کتابوں کا بار گراں طلبہ کے دوش پر رہ گیا اسی کے ساتھ ساتھ زمانہ کی جدید ضرورتیں اس امر کی متقاضی تھیں کہ طلبہ کا کچھ بوجھ ہلکا کیا جائے تاکہ وہ اِن ضرورتوں کی جانب توجہ کر سکیں یہ اسباب تھے جنھوں نے ندوۃ العلماء کے مقاصد میں اصلاح نصاب تعلیم کو داخل کیا اور اراکین ندوہ نے یہ عزم کیا کہ علمائے سلف کی سنت قدیم کے مطابق نصاب تعلیم میں ضروری ترمیم فرمائیں ابتداءً اس مقصد کی مخالفت ہوئی تاہم ندوۃ العلماء نے اُس زمانہ کے مشہور اساتذہ (مثلاً مولنا لطف اللہ صاحب مولنا محمد فاروق صاحب مولنا احمد حسن صاحب) کی مدد و منظوری سے پوری بحث و جانفشانی

کے بعد نصابِ تعلیم ترمیم کرکے ملک میں شائع کیا۔ ندوۃ العلماء نے خیال کیا کہ اس حد پر پہنچ کر اس کا فرض ادا ہو گیا لیکن تجربہ نے بتایا کہ صرف رہنمائی کافی نہیں چلنے کے واسطے سڑک بھی تیار کرنی ہے اور چلنا بھی سکھانا ہے۔ اسی خیال سے ایک بڑے دارالعلوم کے قیام کا ارادہ کیا گیا۔ اُس کی پوری شکل رسالہ کی صورت میں شائع کی اور لکھنؤ میں خدا کا نام لے کر دارالعلوم کھول دیا۔ گورنمنٹ عالیہ نے اراضی نزول کا ایک نہایت خوش فضا اور ہوادار قطعہ عطا کیا۔ ہزہائینس نواب صاحب بہاولپور کی دادی صاحبہ نے پچاس ہزار روپیہ عمارت کے واسطے مرحمت کیا۔ لکھنؤ میں شہر سے دور ایک صحت بخش مقام پر لبِ دریا آپ ایک شاندار عمارت دیکھیں گے جس میں اساتذہ اور طلبہ نصابِ جدید کی تعلیم و تعلم میں مصروف ہیں۔ قیام دارالعلوم کے ساتھ ہی ندوۃ العلماء نے یہ بھی ارادہ کیا کہ قدیم کتابوں کے جو سرمایے دست بُردِ زمانہ سے بچ رہے ہیں وہ دارالعلوم میں فراہم کرکے کتاب خانہ قائم کیا جائے۔ چنانچہ کئی سال کی کوشش میں ایک نادر ذخیرہ کتابوں کا فراہم ہو چکا ہے۔

جدید نصابِ تعلیم کے اجرا میں گو گوناگوں دقتیں پیش آئیں تاہم مسلسل کوشش بیکار نہ رہی اور تلامذۂ دارالعلوم کا ایک خاص گروہ ملک میں خدا تعالیٰ کے فضل سے موجود ہے جو ذوقِ علمی کے ساتھ تلاش و تحقیق کا شایق۔ کتابوں کا کیڑا نہیں بلکہ علم کا دلدادہ ہے تقریر و تحریر پر پوری قدرت رکھتا ہے جن اہلِ علم نے دارالعلوم کے فراغت یافتہ عالموں کی تحریریں دیکھی ہیں وہ کہہ سکیں گے

ع

ایں زمیں را آسمانے دیگر است

یہ ذوقِ تحقیق دوسری جگہ کمتر نظر آئے گا۔ دارالمصنفین اعظم گڈھ کا ماہوار رسالہ "معارف" میرے دعوے کی برہانِ قاطع ہے۔ بارک اللہ فیہم۔ دوسرے عربی مدارس میں اگرچہ ندوۃ العلماء کے اس مقصد سے مخالفت کی گئی لیکن جو غائر نگاہیں تدریجی تغیرات کو جانچ لیتی ہیں وہ پکار اٹھیں گی کہ بڑی بڑی قدیم درسگاہوں کے نظامِ تعلیم میں ندوۃ العلما کی مثال نے تغیرِ عظیم پیدا کر دیا ہے میرے ایک ثقہ محترم دوست نے ایک ایسے عربی مدرسہ میں ندوۃ العلما کا نصابِ تعلیم اُستادوں کے پیشِ نظر پایا جہاں کوئی ندوہ کا نام بھی لینے کی جرأت نہیں کر سکتا شکر ہے کام ہو رہا ہے نام نہ ہو تو نہ ہو

ع

ما نمی خواہیم ننگ و نام را

ندوۃ العلما کے نصابِ تعلیم کی خصوصیات یہ ہیں کہ معقول کا غیر ضروری بار کم کرکے دینی علوم کو ترقی دی گئی ہے خصوصاً علم تفسیر کو ادب پر بھی خاص توجہ کی گئی ہے تاکہ طلبہ میں مذاق ادب پیدا ہو اور بقول مولانا فیض الحسن صاحب مرحوم کے بے ادب نہ رہ جائیں۔ عربی لکھنے اور بولنے پر قادر ہوں۔ فنِ تاریخ جو مسلمانوں کا سرمایۂ ناز ہے شاملِ درس کیا گیا ہے جس سے طلبہ میں مورخانہ تحقیقات کا شوق پیدا ہو جدید علوم سے بھی طلبہ واقف کئے جائیں جدید علم کلام پڑھایا جائے تاکہ فلسفۂ جدید کے اعتراضات اور اُن کے مقابلہ میں تائید مذہب کے طریقوں سے طلبا واقف ہوں۔ بالآخر عام اُصول یہ پیشِ نظر رکھا گیا ہے کہ طلبہ کے دماغ علمی مسائل سے معمور ہوں۔ محض ضمیروں کے مرجع اور اشاروں کے مشارٌ الیہ سمجھنے اور ذہنی تشقیقات پیدا کرنے پر اُن کے علم کا دارومدار نہ ہو بلکہ ایسے روشن اور معقول اصول پر کرایا

ذی فہم ان کے ضروری اور واجب العمل ہونے سے انکار نہیں کر سکتا
ندوۃ العلماء نے اس رمز کو بھی سمجھا کہ تمام فنون کی تکمیل نا ممکن ہے۔
لہٰذا انتہائی تعلیم میں نصاب ایسا تجویز کیا گیا کہ طلبہ اسکو پڑھکر
کسی خاص فن کی تکمیل کر سکیں۔ یہ ظاہر ہے کہ خداوند تعالیٰ نے
انسان کی ذات میں مختلف قابلیتیں ودیعت رکھی ہیں اور
ان قابلیتوں کا رجحان خاص خاص علوم کی جانب ہوتا ہے
نصاب تکمیل کی تجویز سے یہ فائدہ عظیم حاصل ہوا کہ جو طلبہ جس علم سے
مناسبت رکھتے ہیں اپنی پوری دماغی قوت اس کی تحصیل میں
صرف کر سکتے ہیں۔ طلبائے عربی کی ماند و بود کا طریقہ بھی قابل
اصلاح تھا اور اس کا برا اثر جمعیت و شرافتِ نفس پر پڑتا تھا۔
اسی لئے ندوۃ العلماء نے دار العلوم کا جزو غیر منفک دار الاقامہ
کو قرار دیا اور اس کے آئین و ضوابط ایسے رکھے گئے جن سے
طلبہ میں مردانہ اوصاف کو ترقی ہو نیک جائی بود و باش باہم ربط
و ہمدردی پیدا کرے اور ہمارے طلبہ ملک میں اتحاد و کشادہ
دلی کا عمدہ نمونہ پیش کر سکیں۔ ندوۃ العلماء نے اس ضرورت کو
بھی محسوس کیا کہ کیا بہ لحاظ ضرورت زمانہ اور کیا بہ لحاظ ایک علمی
زبان ہونے کے انگریزی زبان کی تحصیل ضروری ہے۔
اس لئے یہ انتظام بھی کیا گیا ہے کہ جو طلبہ چاہیں انگریزی بطور
زبان ثانی حاصل کر سکیں۔ یہ سنکر آپ مطمئن ہوں گے کہ اس
طرز تعلیم کی بدولت ندوۃ العلماء کے ایسے شاگرد موجود ہیں جنہوں نے
علوم عربیہ کی تکمیل کے بعد یونیورسٹی کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی اور
اب معزز تعلیمی عہدوں پر ممتاز ہیں۔ یہ واقعہ بھی کم حسرت کے
لائق نہیں کہ ندوۃ العلماء کے نصاب تعلیم کو مفید و کارآمد دیکھکر
ان شریف خاندانوں کے بچے (جو عربی مدارس کو خیرباد کہہ چکے
تھے) ہمارے دار العلوم میں تحصیل علمی میں مشغول ہیں اس طرح
آپ خیال کر سکتے ہیں کہ جو کام فرداً فرداً جدید و قدیم درسگاہوں
کے امکان سے باہر تھا وہ ندوۃ العلماء کی کوشش سے پورا ہو سکا
ندوۃ العلماء کی مالی حالت کا بھی مختصر طور پر عرض کر دینا ضروری
ہے اس سال جو بجٹ شایع کیا گیا ہے اس میں تخمینہ آمدنی مبلغ
[illegible] درج ہے اس آمدنی میں گورنمنٹ عالیہ ریاست حیدرآباد
بھوپال و بہاولپور کے مستقل عطیے جائداد موقوفہ کی آمدنی
وغیرہ شامل ہیں ایک مد خاص وظائف کی آمدنی کی ہے۔
جس میں بزرگانِ قوم غیر مستطیع طلبہ کے وظائف کے لئے
چندہ عطا فرماتے ہیں۔ اس مد کی آمدنی کی تفصیل پڑھنے سے
یہ مسرت ہوتی ہے کہ صوبہ مدراس کا قدم تمام صوبوں سے
بڑھا ہوا ہے۔ ندوۃ العلماء کا صیغۂ مال مجلس مال کے ماتحت ہے
جلسۂ انتظامیہ کے ایسے ارکان جو مالی امور میں تجربہ و مہارت
رکھتے ہیں اس مجلس کے ممبر ہوتے ہیں۔
موجودہ حالت ندوۃ العلماء کی ضروریات کی یہ ہے کہ عمارت
دار العلوم کی تکمیل نہیں ہوئی۔ مسجد (جو مسجد نبوی کے نقشہ کے
مطابق مبنی تجویز ہوئی ہے) زیر تعمیر ہے۔
بورڈنگ کی اشد ضرورت ہے اس وقت طلبا درسگاہ کے
بعض کمروں میں رہتے ہیں اور اس وجہ سے جو فوائد مدرسۃ الاقامہ
میں رہنے سے حاصل ہوتے ہیں وہ پوری طرح حاصل نہیں ہو سکتے
جس نادر کتاب خانہ کا میں نے ذکر کیا وہ اب تک دار العلوم
دور شہر میں ہے اور اس طرح اس کے فیض سے مدرسین و طلبا دونوں
کما حقہ بہرہ یاب نہیں ہوتے بہرحال متعدد حیثیتوں سے ندوۃ العلما
کو اہل دل کی توجہ اور مالی مدد کی ضرورت ہے۔ خوشی
میں خاتمہ میں خداوند علیم و حکیم کی بارگاہ میں دعا کرتا ہوں کہ یہ جلسہ خیر و
کامیاب ہو اور ملک و ملت کی ترقی میں اس کے آثار نتیجہ خیز ثابت ہوں
وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

یعنی حضرت امیر خسروؒ کے پہلے دیوان کی تاریخی تنقید

شاعر ماں کے پیٹ سے شاعری کا ملکہ لیکر پیدا ہوتا ہے وہ اس سے پیشتر شاعر ہوتا ہے کہ اُسے اپنے شاعر ہونیکا علم ہو سکے اُس کی فطرت میں شاعری کا آتش گیر مادہ ودیعت ہوتا ہے اور یہ مادہ ذراسی تحریک سے مشتعل ہو جاتا اور اُس کی نواسنجی کا باعث بن جاتا ہے۔ ناموافق حالات وحوالی شاعر کے فطری جوش کو نہیں دبا سکتا۔ باطنی قوت اُبھرتی ہے اور بالآخر خارجی قیود پر غالب آجاتی ہے:۔

امیر خسرو کے حالات سے شاعری کی اس عجیب وغریب ملکہ کی حیرت انگیز کیفیت ظاہر ہوتی ہے گرد وپیش کے تمام حالات اور ظاہری اسباب ہر طرح ناسازگار تھے اُن کی رگوں میں ترکی اور ہندی خون تھا لیکن شمشیر آزماؤں اور سورماؤں کا خون تھا۔ باپ لاچین نسل کے ایک ان پڑھ ترک سپہ سالار تھے جنھوں نے ساری عمر تلوار چلائی اور اپنی جان بھی تلوار ہی کے نذر کی۔ نانا راوت یعنی ذات کے چھتری تھے جو پون صدی تک سلطنت کی فوج کے بخشی رہے کون کہہ سکتا تھا کہ سیف شمشی کا بیٹا اور عماد الملک راوت کا نواسہ جو پٹیالی کی جیسے کوردہ میں پیدا ہوا تھا۔ سلطان الشعراء طوطی ہند کہلائے گا اور دنیا اس کے کمال کے سامنے گردن جھکائیگی

کارخانۂ قدرت سراسر اسرار نامتناہی سے گھرا ہوا ہے اسباب وعلل کی عقدہ کشائی پر ہماری دسترس نہایت محدود ہے عقل ووہم کے لئے اُن قوانین کی تہ تک پہنچنا خارج از امکان ہے جو دنیا کی بڑی ہستیاں انہیں نامعلوم طریقہ پر پیدا کرتے ہیں:۔

جس دن سے امیر خسرو کو یارائے گویائی ہوا اُسی وقت سے شعر زبان پر جاری ہونے لگے۔ السعراء تلامیذ الرحمن کسی کی تربیت درکار نہ تھی فطرت کی رہبری میں ارتقائے ذہنی کے مراحل خود بخود طے ہوگئے۔

دیباچۂ تحفۃ الصغر میں کہتے ہیں:۔

عہ تعجب ہے کہ آج تک کسی مورخ اور تذکرہ نویس نے اس کا ذکر بھی نہیں کیا کہ امیر کی رگوں میں ہندی خون بھی شامل تھا خود امیر نے بھی کھلے لفظوں میں ایسے کہیں بیان نہیں کیا البتہ اپنے آپکو ترک ہندوستانی کبھی کبھی لکھا ہے لیکن بیشتر آبائی نسبت سے ضیاء الدین لکھتے ہیں غرہ کے دیباچہ میں جہاں نانا کا ذکر کیا ہے وہاں راوت کا لفظ ایک جگہ ان کیلئے لکھا ہے یعنی عماد الملک کے نام کے ساتھ راوت لکھا ہے (دیکھو ضمیمہ نمبر) یہ لفظ اس عہد کی تاریخ میں بہت مستعمل تھا اور امیر نے بھی اسے بار بار استعمال کیا ہے مثلاً قران السعدین میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ راوت ز رومیں تن خارا شگاف۔ جیسا کہ قران السعدین کے ایک شارح نے لکھا ہے چھتریوں یعنی راجپوتوں میں بہادر شہسوار قوم کیلئے یہ لفظ مستعمل ہوتا تھا۔

"چوں مرا اُستادے سر آمد بر سر تیامدہ بود کہ بر سر دقائق دال شدے و آہوئے مشکبار قلم را از سواد خطا بازنا آوردے ...... چوں طوطیانِ نو آموز آئینہ تخییل را پیش داشتم و از خیالے کہ در تصور می آمد سخن می آموختم۔ یک چند آئینہ دل آہنی بصقالہ کوشش بزدودم .... و مجلداتِ اُستاداں را پیوست در رفتم کار حلاوتے بحاصل آمد و لذتِ سخن کامگار گشت"

اپنی اس وہبی استعداد سے وہ خود بھی متحیر تھے:۔

حیرانِ طبع خودم   بارہا از موجِ تخیل در بحر ہائے
افتم کہ کالِ غور آں نیابند، وے آنکہ غور کند بار بہ بحے
برم از بحرِ سخن چنداں لآلی غلطاں و آبدار در رشتۂ تخیل
نگردمی آید کہ گر نمی توانم آورد" (دیباچہ بقیہ نقیہ)

اور بچپن ہی میں فخر کا حق حاصل ہو گیا تھا ع

سلطانے سلطانِ سلاطین کمال است
(تحفۃ الصغر)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

در قرانہا نظیرہ سلطانی ٭ زیں مضیق خراب نتواں یافت
(تحفۃ الصغر)

اپنی نکتہ سنجی پر دوسری جگہ اس طرح ناز کیا ہے ؎

از زبانِ کلکِ من سوا تہا
در دلِ لولوئے عمانی شدہ ست
(تحفۃ الصغر)

صغر سنی اور طفولیت کا زمانہ مشق کا زمانہ تھا اس زمانہ میں انہماک و توغل کی انتہائی حالت کو انہوں نے خود بیان کیا ہے

سینہ بو الہوس خود بہوس طبعی خود چناں راغب
آں بر عائب غرائب بودہ ام کہ تا شام تا صبح
چوں قلم فرو کردہ دود چراغ می خوردم و شب و روز
سواد بیاض را نقش دیدہ ساختہ ...... بہر جا کہ حے
چو آب زر می دیدم عاقبت جوابے رواں می کردم
و ہر دیوانے کہ ناظر شدم ہمبراں سیاقت تقریر بتحریر
رسانیدم (دیباچہ تحفۃ الصغر)

ارتقائے ذہنی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ جانے پر اُن کی نظر میں بچپن کا کلام کیا کچ سکتا تھا وہ اسے محفوظ رکھنا نہ چاہتے تھے لیکن اپنے مخلص بھائی تاج الدین زاہد اور احباب کے اصرار پر نظر ثانی کے بعد صغر سنی کے اخیر چند سالوں کا کلام انتخاب کر کے تحفۃ الصغر میں یکجا کر دیا اُنہیں اس وقت خیال بھی نہ ہوا ہوگا کہ مورخ اور عالم علم النفس کے لئے اُن کی تمام تصانیف میں سب سے زیادہ دلچسپ یہی مجموعہ ہے جس سے اُس تعجب انگیز استعداد شاعری کا اظہار ہوتا ہے جو بدو شعور سے اُن کی رفیق حال تھی عالم طفلی کے معمولی حرکات و سکنات سے بھی معنی خیز نتائج مستنبط ہوتے ہیں اور نفسِ انسانی کے دقیق اور عمیق اسرار پر روشنی پڑتی ہے۔ بچوں کو کھیل کود کے طور پر الٹی سیدھی لکیریں کاڑھنے اور کیڑے مکوڑے بنانے کا شوق ہوتا ہے نفسیات کا مبصر ان نقوشِ اولین سے ملکاتِ ذہنی کا پتہ لگاتا اور مشاہدہ و ادراک اور تخیل و اختراع کی قوت کا اندازہ کر لیتا ہے ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ خسرو نے صرف سولہ سے بیس برس تک کا کلام محفوظ رکھا اور باقی کو اس قابل نہیں سمجھا کہ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے کیا اچھا ہوتا کہ ہم اُن اشعار سے بھی لطف اندوز ہو سکتے جن سے مکتب میں مشقِ خط کے بہانے مشقِ سخن ہوتی تھی یقین ہے کہ ان نقوشِ اولین میں بھی خسرو کے خط و خال صاف نظر آتے۔ امیر خسرو نے بیس برس کی عمر تک اپنی

۱؎ دیباچہ تحفۃ الصغر

شاعری کا بچپن قرار دیا ہے۔ جس شخص نے ستر برس شاعری کی اور اخیر دم تک قلم ہاتھ سے نہ رکھا بیس برس تک اُس کی شاعری کا بچپن ہی سمجھنا چاہیئے لیکن یہ یاد رہے یہ وہ بچپن ہے جو دوسروں کے عہد کمال سے ٹکر کھاتا ہے۔

سولہ برس کی عمر میں جس زمانہ سے تحفۃ الصغر کا کلام شروع ہوتا ہے خسرو کو تمام اصناف شعر پر دستگاہ حاصل ہو چکی تھی "سلطانی" ان کا ابتدائی تخلص ہے اور تحفہ میں بیشتر قصائد اور بعض غزلیات اسی تخلص کے ساتھ ہیں اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دوسرا تخلص "خسرو" غالباً سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں اختیار کیا۔

امیر کی ولادت ناصر الدین محمود (۶۴۴ھ تا ۶۶۴ھ مطابق ۱۲۴۶ء تا ۱۲۶۶ء) کے عہد میں ۶۵۱ھ ہوئی تھی ان کی پیدائش سے تیرہ برس بعد محمود کا انتقال ہو گیا اور غیاث الدین بلبن تخت نشین ہوا اور بائیس برس تک (۶۶۴ھ تا ۶۸۶ھ) اس نے نہایت جاہ و جلال کے ساتھ حکومت کی تحفہ کا کلام عہد بلبن کے تیسرے چوتھے پانچویں اور چھٹے سالہائے جلوس یعنی ۶۶۷ھ لغایت ۶۷۰ھ میں لکھا گیا۔ عہد ناصری کی کوئی نظم اس میں بظاہر شامل نہیں ہے۔

امیر کا یہ زمانہ پوری آزادی کا تھا جو بعد میں پھر میسر نہیں آیا باپ کا انتقال تو سات ہی برس کی عمر میں ہو چکا تھا۔ خوش نصیبی سے نانا زندہ تھے انھوں نے باپ سے بڑھ کر سرپرستی کا حق ادا کیا۔ انیسویں یا بیسویں برس[1] ایک سو تیرہ برس کی عمر میں ستر سال نہایت عزت کے ساتھ عارضِ ممالک رہنے کے بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا۔

تحفہ میں اُن کے مرثیہ میں ایک پُر درد ترجیع بند موجود ہے اُن کی انتقال پر امیر کا اشکبار رہنا بجا تھا۔ باپ کا غم تازہ ہو گیا دنیا میں کوئی سرپرست نہ رہا اور تلاشِ معاش کی فکر دامنگیر ہوئی آہ اسی دن اُن کی بچپن اور آزادی کا زمانہ ختم ہو گیا۔ کس درد کے ساتھ نانا کو مخاطب کر کے کہا ہے ؎

خسروکہ پار بُد ز بقایت بزرگ اُمید
امسال ہو بجاں غمش کرد ہمچو بید

تحفۃ الصغر میں سلطانِ غیاث الدین اور ولی عہد سلطنت نُصرۃ دین قاآنِ ملک' سلطان محمد کی تعریف میں ترجیع بند اور قصاید میں اور حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کی منقبت میں ایک بہت عمدہ ترجیع بند ہے جس کی تشبیب خاص طور پر قابل لحاظ ہے ؎

شاہِ نوروز درون آمد در شہر صیام
اے دریغا کہ نشاط است دریں شہر حرام

دربار بلبن سے براہِ راست امیر کا کبھی ذاتی تعلق پیدا نہیں ہوا اور شاہزادۂ مذکور سے اس زمانے سے نو دس برس بعد روابط[2] قائم ہوئے تحفہ میں محض مشق و طبع آزمائی کے لئے بطور خود مدح سرائی کی ہے لیکن بارگاہِ مرشد سے رابطۂ خلوص اسی زمانہ

---

[1] حبیب گنج والے نسخہ میں اختلاف کی وجہ سے کو دیباچہ غرۃ میں بیس برس لکھے ہیں لیکن چونکہ تحفہ میں انیسویں برس تک کا کلام ہے اس لئے انیسویں برس زیادہ صحیح ہے۔ [2] دیکھو دیباچہ غرۃ و تاریخ فیروز شاہی مصنفہ ضیا برنی میں جو خسرو کا معاصر ہے امرائے عہد بلبن میں عماد الملک راوت کا مفصل حال لکھا ہے۔

میں قائم ہوا۔ حضرتِ محبوبِ اولیاء قدس سرہٗ کا سنہ ولادت باختلاف روایات ۶۳۳ھ یا ۶۳۶ھ ہے اس طرح وہ امیر سے سولہ ستر برس بڑے تھے ترجیع منقبت کے ایک شعر میں اپنا تخلص سلطانی کے بجائے خسرو اختیار کرنے کی اجازت طلب کی ہے اور یقین ہے کہ مرشد کا شرفِ قبول حاصل ہونے کے بعد یہ تخلص خلعتِ دوام سے سرفراز ہوا

یا بہ از خاکِ درت تاجِ قبول اندر سر
خسروے گردد بر ملکِ سخن سلطانی*

چونکہ منقبتِ شیخ میں صرف یہی ترجیع اور ایک دو رباعی اور قطعہ اس دیوان میں پائے جاتے ہیں اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ امیر کا تعلق شیخ سے غالباً ۶۷۰ھ کے قریب ہوا مدحِ شیخ میں جو رباعی لکھی ہے اُس کے ایک ایک حرف سے اُس عقیدت اور خلوص کا اظہار ہوتا ہے جو تقریباً ساٹھ برس تک امیر کو اپنے ہادی طریقت کے ساتھ رہا اور جو فنا فی الشیخ کی حد تک پہنچ گیا تھا۔

رباعی

گر پاک شود دیدۂ من ز آلائش
اندر تہِ پائے شیخ سازم جائش
حاجت نبود کہ دیدہ را پاک کنم
خود پاک شوم چو عالم اندر پائش — تحفۃ الصغر

اس زمانے میں دیباچہ کو چھوڑ کر خود امیر کے اس زمانے کے ذاتی حالات پر سب سے زیادہ روشنی تحفہ کی مثنوی ڈالتی ہے جو اُنکی جدتِ طبع کا نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ یہ مثنوی جس میں تقریباً دو سو شعر ہیں اُس زمانے کی ہے جب تخلص سلطانی تھا اور کلام کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سولھویں یا سترھویں برس میں لکھی گئی تھی اس مثنوی کے واقعات پر غور کرنے سے مجھے معاً یہ گمان ہوا تھا کہ اس میں پٹیالی کے جو امیر کا مولد ہے حالات لکھے ہیں لیکن بظاہر تمام مثنوی میں پٹیالی کا لفظ کہیں موجود نہ تھا ایک مدت تک جب میں یہ شعر پڑھ رہا تھا

گر نہ ایں از قضائے یزدانیست
بتیالی چہ جائے سلطانی ہست
جائے من بود قبلۃ الاسلام
قبلۂ خسروانِ ہفت اقلیم

معاً یہ گمان ہوا جو بعد میں یقین سے مبدل ہو گیا کہ شعر ثانی کے مصرعۂ اولیٰ میں قبلۃ الاسلام درحقیقت قبۃ الاسلام ہے جس سے امیر اور اُن کے معاصرین مصنفین کی مراد دہلی ہے جو اس زمانہ میں اس لقب سے موسوم تھی اور پہلے شعر میں ناواقف کاتبوں نے بتیالی (یعنی پٹیالی) کو بتیالی سمجھا اور دونوں لفظوں کے رسم الخط میں اس قدر مشابہت قریبہ پائی جاتی ہے کہ اس غلطی کا کوئی بڑا الزام بیچارے کاتبوں پر عاید کرنے کا موقع نہیں ہے۔ مثنوی کے مضامین کا خلاصہ یہ ہے کہ امیر جورِ فلک کا شکوہ کرتے ہیں کہ پورے ایک برس سے دہلی چھوڑ کر پٹیالی پڑے ہوئے ہیں یہ ایک مستحکم قلعہ ہے جہاں جاہل اور جنگ جو افغانوں کا دخل ہے افغانوں کو چھوڑ کر باقی سب مغلوک الحال سپاہی بستے

---

* اسی طرح ایک قصیدے میں جو اقتضائے ملکوت میں ہے فخر کرتے ہوئے اپنے دونوں تخلصوں کو جمع کیا ہے ایک شعر یہ ہے: خسرو کہ در عہد تو سلطان سخن خسرو لاجرم سلطانی شدہ است ایک دوسری جگہ کہتے ہیں: از حد گذشت خسرو سلطانی این بالطفہ۔ یہ اور اسی قسم کا باقی کلام اس زمانے کا ہے جب جدید تخلص اختیار کیا تھا لیکن ابتدائی تخلص بھی ساتھ ساتھ [illegible] طور پر تک بھولا تھا و کلام سلطانی اور خسروی سلسلے کی بیچ کی کڑی ہے۔ ضیائے برنی نے لکھا ہے کہ سلطان بلبن نے دو آب پر تسلط حاصل کرنیکے بعد حفاظت اور قیام امن کیلئے پٹیالی میں حصار تعمیر کیا تھا اور اس میں افغانوں کو بسایا تھا (فیروز شاہی)

ہیں جو سپہ سالار کی آمد پر طرح طرح سے اپنی ناداری کا دکھڑا روتے اور ماتحتوں کے مظالم کی شکایت کرتے ہیں۔ امیر خسرو خود بھی زمرۂ سواران میں شامل ہیں اور تنخواہ اور مدد معاش کا جو غلہ آتا ہے وہ اُن تک پورا نہیں پہنچتا افسران بیچ میں خورد برد کر جاتے ہیں رات کو پہرہ پر جانا پڑتا ہے جب گھڑیال ٹھنڈے گھنٹے بجاتے ہیں تو مچھر ستاتے ہیں انہیں اس جگہ سے دلی نفرت ہے اور سخت وحشت ہوتی ہے دارالسلطنت کے دل فریب مناظر اور ارباب علم و ہنر کی صحبتیں یاد آتی اور رہ رہ کر دل مسوستی ہیں:-

منکہ میلم بہ صحبت ظرفاست — باچنیں قوم زشت باید خاست

طوطی کز سخن شکر باشد — با کلنگان و سارچوں باشد

مت سیں صحن بر کشیدہ باہ — سالے ورزیم ام زروز تباہ

کہ اگر ذرۂ منہ بنشستہ بہ کوہ — کوہ آید زبار آں بہ ستوہ

(مثنوی تحفہ)

ٹپیالی میں صرف دو شخص اُن کے ہمدم ہیں ایک ابو المحامد[1] علاؤ الدین محمد محمود اور دوسرے اختیار لشکرہ داران رفقا کے ساتھ دل بہلانے کے لئے کبھی گنگا کی طرف یا صحرا کی جانب نکل جاتے ہیں اور اشعار خوانی سے غم غلط کرتے ہیں ایک پیدائشی شاعر کے لئے ایک ایسے مقام پر جہاں عمرانی دلچسپیاں مفقود تھیں قدرت کے دل کش مناظر رفیق و تسلی تھے

گر بہ لب دریا سینہ راشوئیم — بانگ یا ترانہ گوئیم

گر خرامیم جانب صحرا — کہ بر و سبزہ ہا ز دل سودا

گاہ گر دیم سوئے گنگ چاں — کہ غم از دل بشوید آب رواں

ہمچناں می بریم در تب و تاب — عمر خود در کرانہ بر لب آب

(مثنوی تحفہ)

اسی دوران میں باران بہار شروع ہو جاتا ہے امیر اُسے فالِ نیک سمجھکر بیدار بختی کی تعبیر دیتے ہیں اور اپنے ممدوح اختیار الدین کی خدمت میں یہ سرگزشت باُمید دادرسی بھیجتے ہیں۔

یہ مثنوی اس زمانے کی ہے جب تک اُنہوں نے خسرو تخلص اختیار نہیں کیا تھا یعنی عماد الملک کا ابھی تک انتقال نہیں ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس مثنوی میں امیر نے شاعرانہ ستم ظریفی سے کام لیا ہے اور بعض حالات کے بیان میں ظریفانہ مبالغہ کیا ہے ورنہ ہم کو تعجب ہوتا ہے کہ اپنی جس تہی دستی اور بیچارگی پر اس طرح اشک باری کی ہے وہ

من کہ از زمرۂ سوارانم — از تہی دستی اشک بارانم

خدمتِ سخت در میاں نانے — کندہ باید بدیں صفت جانے

وہ امیر کو عماد الملک کے حین حیات میں کیونکر پیش آئے۔

ہمیں تو صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ اپنی مرضی کے خلاف انہیں ایک برس تک ٹپیالی میں رہنا پڑا تھا اور چونکہ طبیعت دارالسلطنت کی دلچسپیوں کی عادی ہو چکی تھی اس کورہ میں انہیں ایک ایک گھڑی پہاڑ تھی۔ اس شیوۂ بیانی کا ماحصل صرف اسی قدر ہے کہ ماموں جان ہمیں دہلی بلا لیجئے ٹپیالے میں جی نہیں لگتا۔

حقیقت یہ ہے کہ خاندانی اور ذاتی تعلقات کی وجہ سے امیر کا اکثر زمانۂ حیات دہلی میں گزرا اور شروع ہی سے دہلی اُن کیلئے بمنزلہ وطن کے ہو چکی تھی۔

---

[1] قدرتی مناظر امیر کے دل پر بہت گہرا اثر کرتے تھے مناظر کی تصویر انہوں نے بہت جگہ کھینچی ہے اور اس طرح کھینچی ہے کہ پڑھنے والا دیکھتا رہ جاتا ہے اس مثنوی میں جا بجا [illegible] ... اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جزئیات فطرت کے مطالعہ کو اور اُس کی مصوری کا ملکہ ابتدا ہی سے اُن میں کس قدر موجود تھا۔ [illegible] اختیار الدین امیر کے ایک ماموں کا نام تھا جو پنجاب میں ایک [illegible]

اس مثنوی میں باوجود اس کم سنی کے امیر نے بیانِ واقعات فطرت نگاری شوخی و جدت کا بہت بڑا کمال دکھایا ہے افغانوں اور قلعہ کی ہجو بڑے جوش کے ساتھ کی ہے سپاہیوں کی تباہ حالت کا نقشہ اور اُن کی زبانی ان کی بدحالی کا شکوہ سپہ سالار کے روبرو بڑا موثر ہے دارالسلطنت کے مناظر کا بیان اور بارانِ بہار کی کیفیت بہت دل پسند پیرایہ میں لکھی ہے۔

جس زمانہ میں امیر نے یہ مثنوی لکھی ہے دہلی کو فتح کئے ہوئے مسلمانوں کو کوئی اسی برس گزر چکے تھے۔ ایبک اور التمش کے زمانے میں مسجد قوۃ الاسلام اور قطب مینار تعمیر ہو چکے تھے۔ حوضِ سلطانی بھی التمش کی یادگار تھا۔ مینارے اور حوض کا ذکر مثنوی میں اس طرح کیا ہے:۔

بحر صد چشم در نظارۂ او — مہر منجوقی از منارۂ او
کاہش در بلند پروازی — کرد با زلف مہ رسن سازی
حوض سلطان ز روشنائی و رنگ — سیم محلول ریختست بسنگ

(مثنوی تحفہ)

ایک قصیدے میں جس میں بلبن کی صحت یابی کی مبارکباد ہے اور جشن عام کا بیان لکھا ہے "کوشک لعل" کا ذکر بھی کیا ہے ؎

ز کشک لعل چو بنمود روئے را بنمود
شہ سپہر ز میدانِ سبزش استقبال

خاندانِ غلاماں کے ترک سلاطین کا مستقر یہی قصر تھا جو شہر کے اندر دارالسلطنت کے کسی مناسب موقع پر بنا ہوا تھا بلبن کے رنگیلے جانشین کیقباد (۶۸۶ھ تا ۶۸۹ھ) نے جو سلسلہ غلاماں کا اخیر تاجدار تھا۔ قدیم دارالسلطنت کے محل وقوع سے ہٹ کر کوئی چھ سوا چھ میل شمال مشرق کی جانب قصر کیلوکھری تعمیر کیا اس کے بعد تو پھر گویا ایک رسم قرار پا گئی کہ جو نیا بادشاہ ہوا اور وقت نے مساعدت کی ہر ایک نے قدیم مرکز حکومت کے قریب نیا کوشک بنوایا اور نیا دارالسلطنت قائم کیا۔ جلال الدین خلجی نے حصار کیلوکھری کی تکمیل کی علاء الدین اور قطب الدین نے سیری میں دارالخلافہ تعمیر کیا۔ غیاث الدین تغلق نے تغلق آباد بنوایا غرض امیر کے سامنے پچاس برس کے اندر دہلی کا پھیلاؤ کہیں سے کہیں پہنچا۔ اللہ اللہ آج کھنڈروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا نہ کوشک لعل کا نام و نشان باقی رہا نہ طبل شاہی کی آواز ہے ؎

ز طبل شاہی آوازہا کہ بر میخاست — بشرق و غرب ہمی رفت و جنوب و شمال

(تحفہ)

بقیہ صفحہ سابقہ: بہر زمانے وسطالحیات کے ایک قصیدے میں ان کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎ نخست خان بزرگ اختیار دین کہ بنام ہست کز نام محمدت والانام اس ابتدا میں مجھے اس نام کے متعلق غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی اور میرا یہ خیال تھا کہ اس نام سے اختیار الدین کشلی خاں عرف ملک چھجو مراد ہے جو سلطان بلبن کا بھتیجا تھا جس کی ملازمت امیر نے ناصر کے انتقال کے بعد اختیار کر لی تھی امیر کے ماموں اور ملک چھجو کے علاوہ امیر کے ایک دوسرے مربی علی بن ایبک (حاتم خاں) کا لقب بھی اختیار الدین تھا امیر کی تصانیف میں اسما اور القاب کی تطبیق میں نہایت احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے ایک ہی لقب سے مختلف زمانوں میں مختلف ممدوح موسوم پائے جاتے ہیں اس لئے امیر کے ملازمت اور ہر عہد کی تاریخ پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ تطبیق میں مغالطہ نہ ہو۔ تحفہ کے زمانۂ تصنیف سے کوئی پندرہ سولہ برس بعد ایبک سے تعلقات پیدا ہوئے علاوہ ازیں اکثر جہاں اختیار الدین سے مراد کشلی خاں یا حاتم خاں ہیں وہاں امیر نے ان کا نام بھی لکھا ہے۔

عروس البلاد کے جشن و تماشائے عام کی ایک کہانی رہ گئی ہے ؎

بروز جمعہ بیارا ستند ہچو عروس
برائے شاہ جہاں شہر را بہ بیور وال (تحفہ)

یہ امر نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اس عہد میں جسے مورخین بالعموم غلطی سے عہد افغانیہ یا پٹھانوں کا زمانہ کہتے ہیں سلطنت پر ترکوں کا تسلط تھا اور عنانِ حکومت تمام تر سلاطین و امرائے ترک کے ہاتھ میں تھی امیر نے افغانوں کا اور بھی کئی کتابوں میں ذکر کیا ہے لیکن اس طرح جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں ان کی حیثیت میں کسی قسم کا سیاسی امتیاز یا تفوق پیدا نہ ہوا تھا۔ جہاں فوج میں سلطنت کی مختلف نسلوں اور متفرق ملکوں کے سپاہی نوکر تھے وہاں افغان بھی تھے اور بلاشبہ اپنی شہرہ پیشی اور جنگجوئی کی وجہ سے اچھے سپاہی سمجھے جاتے تھے تاریخ کا یہ عہد خالص ترکوں کی حکمرانی کا عہد ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی غلطی نہیں ہو سکتی کہ اسے افغانوں کا زمانہ کہا جائے جن کا تاج و تخت میں کوئی حصہ تھا نہ خاص سیاسی اہمیت حاصل تھی:۔

اس مقدمہ کے ختم کرنے سے پہلے تحفہ کی ایک نمایاں خصوصیت پر نظر ڈال لینا ضروری معلوم ہوتا ہے تمام اساتذۂ فن نے خسرو کو صنائع اور بدائع کا بادشاہ لکھا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ لفظی و معنوی صنعتوں سے اُن کی طبیعت کو خاص لگاؤ تھا ذہنی ترقی کے بعد اُنہیں معلوم ہو گیا تھا کہ سچی شاعری کا بڑا حسن سادگی اور جذبات میں ہے اور یہ سب تکلفات لا حاصل ہیں۔ اسی وجہ سے جوں جوں عمر ترقی کرتی گئی اُن کا کلام بتدریج اس قسم کے خس و خاشاک سے پاک ہوتا گیا۔ بعد میں صنائع بدائع کا تمام التزام امیر نے نثر کے لئے مخصوص کر دیا تھا اور سارے تکلفات اس کی آرائش میں صرف کرتے تھے تحفہ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہو گا کہ اگر مذاق سلیم رہبری نہ کرتا تو امیر کی شاعری کے لئے یہ بڑا خطرہ تھا سارا دیوان صنعتوں سے بھرا پڑا ہے اور کہیں تو اس قدر بھر مار ہے کہ بعد میں وہ خود جب ان چیزوں کو دیکھتے تھے تو ہنستے تھے اور بچپن کی خام طبعی کہکر معذرت کر دیتے تھے۔

ایک قصیدہ ۲۷ اشعار کا شہاب مہمرہ کے اتباع میں لکھا ہے اور ہر بیت میں مور و مو کا التزام ہے ؎

شہاب مہمرہ در مور گفتہ است خوب تر شعرے
دل چوں مور من نیز از قضا سفتہ آں قدر موئے
چو من مورے کجا موئے بخاک پائے او مانَد
چہ مردانِ اسد بازے چہ ہم سنگ گہر موئے
ولیک از راہِ گستاخی بہ مور و موئے آورد م
نہاد از مور طبعم تیز زیں سان پد رر موئے

ایک قصیدے میں روئے و موئے ماہ و مہر اور شانہ و آئینہ کا التزام ہے بڑی موشگافیاں کی ہیں ہر شعر میں یہ چھ لفظ نبھائے ہیں۔ تقریباً چالیس شعر لکھکر دم لیا ہے تشبیب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اے ماہ بستہ روئے تو مہر اندر آئینہ
موئیت ز شانہ ریختہ عنبر بر آئینہ

ــه امیر خسرو سے پہلے سالوں میں دہلی کے صف اول کے شعرا میں شہاب مہمرہ بدایونی مشہور شاعر تھا امیر نے ایک جگہ شہاب مہمرہ کا ذکر کیا ہے [illegible] بداؤن میں [illegible] آغاز [illegible]
شیخ عبد القادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں شہاب مہمرہ کو رکن الدین بن سلطان التمش کے عہد کے مشہور شعرا میں لکھا ہے اور [illegible] اسی صنعت [illegible] ایک [illegible] قصیدہ [illegible] شعر [illegible]
[illegible] (۱ [illegible] مطبوعہ لکھنؤ)

بفشاند مشکِ موئے تو از شانہ گرد ماہ ؎
بنمود عکس روئے تو مہر اندر آئینہ

تحریر

از بہر موئے و روئے تو اے شاہِ مہرباں ؎
گرد در دستِ شانہ و از خنجر آئینہ

آں شاہِ مہر تیغ علاء دول کہ ہست ؎
در موش ماہ شانہ بروشش اختر آئینہ

موئے اگر ز شانہ دہد ماہ را بہ مہر ؎
مہ را کشد چو روئے وے اندر بر آئینہ

اپنی موشگافی کا ذکر:-

خسرو در روئے موئے شگافی چو شانہ گشت
در دست ... مہر ہست در خور آئینہ

دعا

میخور بجام مہر و مہ از ساقئ کہ کرد
مویش چو روئے شانہ پر از عنبر آئینہ

چوں مو بچنگ شانہ اسیر تو مہر و ماہ
واز روئے تو بہ مہر ضیا گستر آئینہ

از دست بخت شانہ دولت بروے تو ؎
واز مہر و مہ بروے تو تا محشر آئینہ

اس کے علاوہ کسی قصیدے کے قافیہ میں ناخن کا کسی میں انگشت کا کسی میں کمر کا کسی میں آئینہ کا التزام کیا ہے ایک قصیدے کی تشبیب میں معشوق کا سارا سراپا صنعت کے قلم سے کھینچا ہے مطلع ہے۔

فرق تو از طریقِ فسوں سازی اے نگار
آوردہ راہ مور پدید از دہانِ مار

حق یہ ہے کہ خوب اشعار نکالے ہیں۔ ابرو کا ذکر دیکھئے۔

ابروئے تو کہ سخت بلند است چوں کماں
پیوستہ تا بگوش کشش بہر کارزار

جفت ابروئے ترا نہ سزد عقدہ درمیاں
بے عقد اگرچہ جفت ندیدیم ساز دار

در چشم جادوئے تو ز اعجاز جادوئے
بار وزِ تیرہ گشتہ شب روشن است یار

در دو ستارۂ تو بہر از نظر کنم
یک تیر غمزۂ تو دو چشم کند چہار

بینتالیس شعر میں سراپا لکھا ہے اور گریز کے صرف دو تین شعر میں مدح ختم کر دی ہے پھر مطلع ثانی لکھکر تشبیب بہار شروع کی ہے اور پینتیس شعر بہار کے لکھکر صرف تین شعر میں گریز و مدح ہے جزو ثانی میں سلطانی اور جزو اول میں خسرو تخلص ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں در اصل ایک وقت نہیں لکھے گئے بہار کے بیان میں وہی فطرت نگاری اور حقیقت طرازی ہے جس کی ایک پیدائشی شاعر سے توقع کی جاتی ہے

آبر از برائے تہنیت گلشن ربیع ؎
کرد آستینِ سبزہ پر از دُر شاہوار

بہمن برآنکہ زود زند تیر بر خزاں ؎
از شاخ سرو یافت کماں چوں سفندیار

بیدست بر کشادہ سناں بر سیاہ دے ؎
باد ہست باز دادہ عناں را برا ہوار

پیکانِ غنچہ گشتہ ز سوہانِ باد تیز ؎
گلہا سپر کشیدہ بسر بہر کارزار

داد آسماں زمین بہشت را تقاضائے نو ؎
دگلستان نشانۂ وے را خدنگ خار

صد نقش بست باد شمالی بروئے آب
صد رنگ ریخت رنگ ریاحین بر دو با

چوں باد بر سر آمد سلطانِ غنچہ را
از تنگ خار جامہ تنگ کردہ پارہ پا

پھولوں کی بہار دیکھئے ؎

گلہائے کوزہ بر صفت کاسہائے سیم
پُر کرد خوانِ زر زرِ خالص کناں نثار

از کاس لالہ خورد مگر برگ کوزہ مے
کافتد بہر طرف چو حریفاں بادہ خوار

از بس کہ خونِ لالہ بہ گردن گرفت کوہ
پایش بگل بماند سر سرگشتہ سنگ سار

صد برگ برکشاد درِ ناز بر قفاش
بیروں کشید خنجر بیداست روزگار

داند بنفشہ کو تہی عمرِ گل از انکہ
خم قامت و کبود لباس ست سوگوار

موئیست سر بسر تنِ سنبل وزین قبل
موئے نمی برد ز سر زلف غم گسار

گنج زراست در دہنِ نرگس خراب
شک نیست گنج را بہ خرابی بود مدار

صد برگ راز پردۂ عصمت بروں فگند
سوری چو دور کرد ز بالائے سر خمار

بالش گرفت خسرو گل بر سر شاخ
پس از دہاں بخند بروں ریخت برکنار

یک پا ستادہ گرد سرش چوں سلاحیاں
سرو کماں کشیدہ او شد سناں گزار

گسترد بادِ فرش ریاحین بروئے خاک
افگند باغ نطع بساتینِ شاخسار

بلبل کہ ہست تحاجیت خاص از ادائے فضل
جاں از شگوفہ برد و دل خستہ از شمار

مرغانِ باغ راپس ازیں ساز پیش نو دھد
سلطانی از ثنائے سلیمان روزگار

سبحان اللہ اس تشبیب کو دیکھئے اور ذرا شاعر کی صغر سنی کا خیال کیجئے سچی شاعری کے یہی جوہر تھے جو خسرو کے ہاں ابتدا ہی سے نمایاں تھے اور جن کے مقابلہ میں تصنعات کو زیادہ فروغ پانے کا موقع نہ ملا اگر خدانخواستہ طبیعت بالکل ادھر کی ہو کر رہ جاتی تو کیا حال ہوتا؟ خسرو سے بڑھکر کسی کے لئے یہ خطرہ نہ تھا اسی زمانہ میں جہاں ان کی سچی شاعری کے نمونے بھی کافی موجود ہیں محض لفظی تصنعات کی طرف نسبتاً زیادہ التفات معلوم ہوتا ہے۔ ایک قصیدہ ہے جس میں لفظی الٹ پھیر ہی میں تیس شعر لکھ ڈالے ہیں۔

مشتے نمونہ از خروارے

چند اشعار ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے نقل کئے جاتے ہیں ؎

بر عارضِ خوبت چہ کنم عرض عریضہ
از چشمۂ ہر چشم چشمۂ دیگر

مشہور بہ شہرم ز توائے شہرۂ صد شہر
ہمچوں کرم از مکرمت مکرم کشور

محمود محمد فخر و در خود د محامد
پور عرض عمر عرض راشد بعد

ازکاہشِ غم کاہ شود پیشِ شکوہش — فرقدؔ تو فرق شدہ بر سر فرقدؔ
معزول بوقار از شود آں ذاتِ موقر — معرم ز شعارش شدہ از شعری برتر

سید حسن برنی

تجرید

ہر دل کہ در وماية تجرید کم است — بیچارہ ہمہ عمر ندیم ندم است
جز خاطر فارغ کہ نشاطے دارد — باقی ہمہ ہرچہ ہست اسبابِ غم است
(عمر خیام)

اکثر الفاظ بعض دفعہ غلطیوں کا باعث ہو جاتے ہیں بعض لوگ محض الفاظ پرستی کی دھن میں پھنس کر ان امور کے قائل ہو جاتے ہیں جو نہ صرف اخلاق ہی کے منافی ہوتے ہیں بلکہ خود انسانی فطرت کے بھی خلاف ہوتے ہیں لفظ تجرید بھی بعض کے واسطے بعض دفعہ چند در چند غلطیوں کا باعث ہو جاتا ہے جب تجرید سے مراد ناکتخدائی لی جاتی ہے تو یہ غلطی تمدنی رنگ میں بہت کچھ نقصان کا موجب ثابت ہوتی ہے بعض لوگوں کا یہ مقولہ ہے کہ مجرد رہنا زندگی کی خوش اسلوبی گزارنے کے واسطے ایک اچھا ذریعہ ہے ممکن ہے کہ اس میں کچھ سچائی بھی ہو لیکن تمدنی ضروریات کے واسطے یہ مؤثر ایک ایسا غلط راستہ ہے کہ جس کی غلطی سے کبھی انکار کیا ہی نہیں جا سکتا تمدن کی سب سے بڑی کڑی مناکحت اور شادی ہی ہے یا یوں کہیے کہ تمدن اسی رشتہ سے شروع ہوتا ہے یا اس پر اس کا بہت کچھ مدار ہے جب انسان متمدن الطبع ہے تو وہ کس طرح تجرید پر فتویٰ دے سکتا ہے اور کس طرح تجریدی رنگ قبول کر سکتا ہے اگر ایک طرف وہ اپنی فطرت میں تمدنی مواد پاتا ہے اور دوسری طرف عمل میں پیچھے رہتا ہے تو گویا وہ خودکشی کرتا ہے فرض کرو کہ تجرید ایک اچھا مسلک ہے سب لوگ مجرد ہوں تو یہ دنیا کس رنگ میں ہو جائے۔

یہ کہنا کہ تجرید میں انسان خوش اور آزاد رہتا ہے ایک سخت غلطی ہے ہمیشہ انسان باوجود دعوے آزادی کے جب تک کوئی پابندی اپنے آپ پر عاید نہیں کرتا تب تک وہ خوش رہ .... ہی نہیں سکتا کھانے پینے میں دیکھو کس قدر پابندیاں ہیں چلنے پھرنے میں کس قدر پابندیاں ہیں اگر یہ پابندیاں نہ ہوں تو زندگی انسان کی ایک تہلکہ میں پڑ جاوے عورت اور مرد کا رشتہ خود انسان نے نہیں بنایا قدرت نے بنایا ہے اور خواہ کوئی کتنا ہی توڑے ٹوٹ نہیں سکتا یہ دونوں کڑیاں انسانی زندگی کا شروع

اور خانقاہ میں اگر ایک کڑی ٹوٹ جائے یا الگ کرلی جائے
تو گویا ساری زنجیر ہی ٹوٹ گئی ۔
بعض لوگ کہتے ہیں علایق دنیا سے قطع تعلق ایک تجربہ ہے
اور اس تجربے سے انسان کی قوتیں تزکیہ پاتی ہیں یہ کسی قدر
درست ہے کہ علایق سے وابستگی بعض دفعہ بہت کچھ
تکلیف کا باعث ہوتی ہے لیکن کون کون سے علائق
توڑ دینگے سب سے زیادہ علاقہ اور وابستگی تو اس دنیا میں
رہنے کی ہے اور پھر اکل و شرب کی یہ تو کسی حالت میں بھی
دور نہیں ہوسکتی اگر کوئی شخص بعض ضروریات کے باعث
قطع علائق کرتا ہے تو شاید اُس کی دلیل کوئی جان رکھتی ہو
اور ایسی مثالیں مستثنیات میں داخل کی جانی چاہئیں ۔
لیکن ایک کلیہ کے طور پر تجرید کی مدح سرائی تمدن کی مذمت ہے
بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ :-
اگر عورت و مرد کا میل جول تحت اغراض شہوانی کے ہے تو
یہ بات بلا تعلق عورت و مرد کے عارضی طور پر بھی حاصل
ہوسکتی ہے ملک فرانس میں اس قسم کی تصویریاں نکالا کرتی تھیں
لیکن موجودہ جنگ نے ثابت کر دیا ہے جن لوگوں نے یہ
تھیوری قائم کی تھی وہ ملک و قوم کی سرسبزی کے سخت
دشمن تھے اگر بعض صوفیوں نے تجرید پر زور دیا ہے اور وہ بھی
دو چار تو ان کے دلائل ہی کچھ اور ہیں اُن کی
غرض صرف تزکیہ ہے اور ان لوگوں کی غرض بے لگامی
اور خود داری ہے ۔
یہ کہنا کہ کھلے تعلقات میں اچھائی اور فائدہ ہے ایک سخت
مغالطہ ہے انسان جب کسی معاملہ میں کھلا رہ کر فائدہ نہیں اُٹھا
تو اس صیغہ میں کیونکر فائدہ اٹھا سکتا ہے ہر جائی ہونا بعض
حالات میں اگر اچھا ہے تو اس صیغہ میں تو سخت معیوب ہے
اور دل کی تسکین تو کسی صورت میں بھی میسر نہیں ہوسکتی
کیونکہ دونوں طرف آزادی ہونے کی وجہ سے وہ محبت
اور خلوص نہیں ہوتا جس کی ضرورت ہے دونوں
طرف سری چک ہوتے ہیں اور موقع کے منتظر نکاح ایک معاہدہ ہے
دنیا میں کوئی کام سوائے معاہدہ کے نہیں ہوتا اس طرح
یہ معاہدہ قائم رہنا ضروری ہے یہ کہنا کہ عدم پابندی
کی صورت میں بھی ایک معاہدہ ہی ہوتا ہے یہ درست
نہیں یہ معاہدہ ہوتا ہی نہیں بلکہ ایک قسم کی خوش باشی
ہوتی ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا لوگ سمجھتے ہیں کہ
شادی کی ضرورت جوانی میں ہی ہوتی ہے یا صرف اولاد
ہی نصب العین ہے شادی کی غرضیں اور بھی ہیں وہ
کیا کیا :-
طمانیت قلب ۔ ضرورت تمدن ۔ رفاقت ۔
خانہ آبادی ۔ نظم ضروریات ۔
یہ وہ ضرورتیں ہیں جو ہر شخص کو اپنی زندگی میں پڑتی رہتی ہیں
اور جس سے کسی کو گریز نہیں اور نہ کوئی ان سے انکار
کرسکتا ہے سب سے زیادہ ضرورت عورت کی اولاد
ہونے کی صورت میں ہی ہے اور خانہ آبادی کے واسطے
بھی لیکن زیادہ تر ضرورت بڑھاپے میں ہی ہوتی ہے
جب بال بچے بھی پرورش پا کر ادھر اُدھر ہو جاتے ہیں
تو اعزہ جواب دیجاتے ہیں احباب کی رفاقتیں چھوٹ
جاتی ہیں خیالات کا ایک دوسرے سے الگ ہونا یا نہ ہونا بھی محتاج
ہونے لگتا ہے پرانی صحبتوں کی ضرورت ہوتی ہے ایسے
حالات ایک بلا تکلف رفیق اور محرم راز کی ضرورت ہوتی ہے

تکلیف پوچھو ان لوگوں سے جن کی بیویاں یا رفیق پیری کے
زمانہ میں جدا ہوگئے ہیں بال بچوں کی نظروں ہی میں پھر جاتی ہیں
کچھ دنوں کے بعد پھبتیاں کرنے لگتی ہیں اور لڑکے پوتے
ایک عضو زائد سمجھ کر دن بدن متنفر ہوتے جاتے ہیں ادھر یہ
مصیبت کہ پیرانہ سالی کچھ کرنے نہیں دیتی جسارت
جواب دے چکتی ہے ادھر خدائی نوجوان جن سے دنیا خالی نہیں
کہیں کھینچے لگ جاتے ہیں اب تو حضرت کسی مسجد یا کسی مندر میں بیٹھنا
چاہئے یہ کوئی وقت ہے کہ خود بدولت بال بچوں اور بہوؤں
میں نازدن (کھوں کھوں) کرتے رہتے ہیں یعنی کھانستے رہتے
ہیں۔
دیکھو بڑھاپے میں بیوی کی کس قدر ضرورت ہے ایک مقتدر
آدمی نے کہا کہ اگر میں کچھ بھی وصیت کروں گا تو یہ بھی اس میں
لکھوں گا کہ اگر کوئی ۸۰ سال میں بھی زندہ ہو جاوے تو بھی
بیوہ مناسب عمر سے شادی ضرور کر لے کسی مہمان نے پوچھا
یہ کیوں قبر میں پاؤں اور شادی جواب دیتے ہیں کہ میری
مراد کسی کنواری اور نوجوان عورت سے شادی کی نہیں ہے
بلکہ اپنے سے کوئی پانچ دس سال کم عمر کے ساتھ تم دیکھتے نہیں ہو
کہ میری ساری عمر کمائی میں گزر گئی ہزاروں روپیہ جوں توں
کر کے کمایا اور اپنی جان پر مصیبتیں لیں اب بیوی کے مرنے
یعنی یوں ملتی ہے جیسے نامرغوب نوکر نامطیع ہر خاندان کو
ہر شخص دیکھتا ہے کہ کب گلے سے اترتے ہیں۔ اس قسم کے
واقعات مشاہدہ میں گزرے ہیں اور اتنی ضرورتیں بعض کو
ایک عمر میں [illegible] آتی ہیں اگرچہ ایسے لوگوں کی کہنا یا
عام طور پر [illegible] نہیں سمجھتے ہیں مگر پھر بھی ان میں کچھ
اصلیت ہوے۔

ایک دفعہ ایک ڈاکٹر یورپین سے پوچھا کہ اب آپ جو پنشن
لیکر جاتے ہیں ولایت جا کر کیا کریں گے فرمایا کہ ایک سال تو
سیر سیاحت میں گزاروں گا اور بعد ازاں شادی کروں گا۔
تعجب سے پوچھا کہ اس عمر میں۔
فرماتے ہیں میں شادی صرف رفاقت کی خاطر کرتا ہوں
ایسی رفاقت جس کی وسعت مجھ سے زیادہ تر وابستہ ہو
یا وابستہ رہنے کا خیال کیا جا سکے چونکہ ولایت میں تھوڑے
دن کے رفاقت بڑی مہنگی ملتی ہے اس واسطے یہی ارادہ ہے
میں نے کہا کہ آپ کی عمر زیادہ ہے بیوی کس عمر کی ہوگی۔
فرمایا کہ کوئی ۲۸ - ۳۰ - ۳۵ سال کی ہو تو بہتر ہوگا۔
پھر میں نے پوچھا کہ موت آپ پر جلد تر ہاتھ صاف کرے گی
کہا کہ میں ڈاکٹر ہوں بہ نسبت تمہارے اس بارہ میں ایک اچھا تجربہ
دیکھتا ہوں مرنا جینا قدرت کے ہاتھ میں ہے کم عمر پہلے مر جاتے
ہیں اور بڑی عمر والے باقی رہتے ہیں بہ نسبت بوڑھوں کے
بیوگان کے جوانوں کی بیوگان عموماً زیادہ ہیں۔
پھر میں نے کہا کہ اس قسم کی رفاقت کی ضرورت کیا ہے۔
فرمایا کہ شاید تم کو نہ ہو مجھے تو ہے میں اپنا جواب خود
ہوں فرمایا کہ دنیا میں کوئی ایک قسم کی جنگیں ہوتی ہیں یہ بھی ایک
قسم کی جنگ ہے جب اور جنگوں کے کشتوں پر معمولی افسوس کے
سوائے اور کچھ نہیں کیا جاتا تو اس میں بھی وہی صورت ہے
میں نے پھر پوچھا فرض کریں کہ آپ گزر گئے اور آپ کی بیوی
زندہ رہی پھر اس کی حالت۔
کہا کہ جو نوجوان کی بیوگان کی ہوتی ہے۔
میں نے کہا کہ آپ کے دل و دماغ پر اس صورت میں کیا
گزرے گی۔

کیوں خواہ مخواہ گیا جاتا ہے عورتوں میں تارکہ رکھی جاتی ہیں مگر ایک تارکہ کا قصہ سن لو اور یہ قصہ محض قصہ نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے۔

ایک شہر میں ایک اچھا اور ممتاز کنبہ تھا اُس میں ایک تارکہ تھی جو کوئی پچاس سال کی ہو کر مری مرنے سے اول اُس نے یہ کلمات خاندان کے تمام عورتوں اور مردوں کو بلا کر انہیں کہا بات کھوں گی۔

تم سب لوگ ایمان سے کہہ سکتے ہو کہ میں شروع عمر سے اب تک جس کو پچاس سال گزرتے ہیں اللہ کے فضل و کرم سے بالکل نیک اور باعصمت رہی میرے دامن عصمت پر ایک داغ بھی نہ پڑا یہ میری جواں مردی نہیں یہ اللہ میاں کا فضل ہے۔

مگر تم سن لو کہ باوجود اس کے بھی میری یہ حالت تھی کہ جب کبھی پس دیوار کسی مرد کی آواز سن لیتی تھی تو میں ایک استقامت اور استقامت بھی صادقہ کے ساتھ یہ سوچا کرتی تھی کہ سب سے زیادہ گناہ جائز حقوق فطرت کا مار دینا ہے یاد رکھو اس کے بعد کسی لڑکی کو تارکہ نہ رکھنا کیونکہ یہ وہ گناہ ہے کہ جس کا اس دنیا میں کوئی معاوضہ نہیں ہو سکتا۔

بہت سی عورتیں اور مرد بھی ضبط کر سکتے ہیں مگر یہ ضبط ضبط نہیں ہے بیوگان کا نکاح لازمی ہے

یہ اس عورت کے کلمات ہیں جو فی الواقع ایک مسلمہ نیک بخت تھی اُس نے اپنے افعال اور اپنے اعمال کی حکومت سے خود کو ساری عمر آلودہ نہ رکھا لیکن توسیع خیال کا رکنا بہت ہی مشکل ہے بیشک محض خیالات کی وجہ پر خدا باز پرس نہیں کرتا مگر یہ بھی ایک عذاب ہے۔

بیوگان کا نکاح شریعت نے اس واسطے مشروع کیا ہے ہاں جو عورت اپنی قوتوں اور اپنے خیالات پر بھروسہ کر کے کچھ اور ارادہ کرے تو یہ اُس کی ہمت ہے اور شریعت اُس صورت میں کسی پر جبر نہیں کرتی شریعت اسلام میں نکاح بھی ایک ایسا ہی اور ضروری کام بیان کیا گیا ہے لیکن اگر کوئی نکاح نہ کرے بوجوہ تو اس پر کوئی شرعی گرفت بھی نہیں

البتہ اگر کوئی شخص شریعت کی ترمیم کر کے یہ کہے کہ نکاح جائز نہیں اور تجرد ہر حالت میں مباح اور مفید ہے تو یہ لا رہبانیۃ فی الاسلام کی تردید یا ترمیم ہے اور یہ درست نہیں۔ اسلام ایک فطری مذہب ہے چونکہ فطرت نکاح کی مؤید و مؤکد ہے اس واسطے وہ بھی اُس رنگ میں اُس کی مؤید اور مؤکد ہے اور تمدنی مراحل اور دیگر ضروریات زندگی کا بھی بہت کچھ مدار ہے۔

تجرد سے مراد محض تارک خدائی ہی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ جو انسان اس وقت تک خوش اور مطمئن نہیں رہ سکتا یا اسے فراغ خاطر میسر نہیں آسکتا جب تک کہ وہ ایک خاص شغل یا کام مرجع مد نظر نہ رکھے انسان کچھ کچھ خبطی بھی ہے یا جنونی اسے ایک خبط اور جنون کی سی اپنی حالت کے مطابق ضرورت رہتی ہے اور اس صورت میں وہ دوسرے مشاغل اور دوسرے امور سے الگ ہو کر صرف ایک ہی امر کو مد نظر رکھ کر تفریح حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے دیکھو بعض شطرنج میں بھی ایک تفریح پاتے ہیں بعض پتنگ بازی میں بعض شعر و شاعری میں بعض راگ میں بعض شکار میں بعض مطالعہ میں بعض سیر و سیاحت میں اور بعض حسن پرستی میں اپنے اپنے مذاق کے مطابق ہر ایک شخص کا کوئی نہ کوئی مطمح نظر ہوتا ہے اور وہی اُس کے واسطے ایک مصالحہ زندگی ہوتا ہے اور ایسا خبط یا جنون اُس کی طمانیت کا موجب ہو جاتا ہے۔

خوشا آنکہ من از دانش فرزانہ‌ام
آنکہ پایم گرانیں زنگ برائیم

یہ تجرید حسب رائے حضرت عمر خیام رحمۃ اللہ علیہ سب سے زیادہ
اسلم تجرید ہے اور اس تجرید سے دنیا کے بہت سے کام بھی
چل رہے ہیں وجہ سبب یہ کہ دنیا میں اور کام بھی کرکے ان کا
حصہ بھی پورا کرکے خصوصیت سے ایک کام مطمح نظر رکھ لیا جاوے
جس طرح ہر انسان سب جگہ پھر پھرا کر رات کو اپنے گھر میں آ کر
اپنے بستر پر آرام کرتا ہے اس وقت جو کچھ اسے لطف آتا ہے
اور جمعیت میں بھی وہ جو کچھ طمانیت پاتا ہے وہ گویا ایک تجرید ہی
کا نتیجہ اور اثر ہوتا ہے ہر شخص کا جدا جدا گھر ہونا ایک تجرید ہی ہے
اور یہی فراغ خاطر کا موجب بھی ہے۔
مائے تجرید کیا ہے سب علائق سے رشتہ اشنا ہو کر صرف ایک
ہی علاقے سے وابستہ رہنا یا اس سے لذت یاب ہونا یا جو
لوگ جیسی رنگ میں خدا رسیدہ اور خدا پرست ہوتے ہیں
وہ دنیا سے باہر نکل جاتے ہیں یا کھاتے اور پیتے ہیں زندگی
کی اکثر منزلیں وہ بھی طے کرتے ہیں اور اس دنیا میں رہتے
بھی ہیں لیکن چونکہ ان کا اصل الشغل صرف خدا یا خدا پرستی
ہوتا ہے اس واسطے انہیں خدا پرست اور خدا رسیدہ کہا
جاتا ہے ورنہ ہوتے وہ بھی اس دنیا میں ہیں۔

جمعیت دنیا از خدا غافل شدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

اس دنیا میں سوائے خدا پرستی کے اور بھی طریقے دیگر
لوگوں کے واسطے تجرید کے ہیں قرآن مجید میں آیا ہے
کل حزب بما لدیہم فرحون

یہ شعر اسی تجریدی کی جانب اشارہ ہے یعنی مجھ کو یہ باہمی
حضرت عمر خیام کی اسی آیت کریمہ کی تصریح اور تفصیل میں ہے
ہر شخص کو کوئی نہ کوئی تجریدی رنگ رکھنا چاہیے کیونکہ اس کے
بغیر زندگی کے دن اچھے نہیں گزرتے اور لیکن تجریدی رنگ
دنیا سے نکل کر حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ اس دنیا میں رہ کر آنکھیں
بند کرکے اور کانوں میں روئی دے کر یہ کہنا کہ دنیا
اور مناظر دنیا سے بہت پیچھے ہٹ گیا ہوں ایک فضول اور عام
مرد وہ ہے جو اس دنیا اور اس کشمکش میں رہ کر کوئی تجریدی
رنگ رکھتا ہو اور سب سے بڑا تجریدی رنگ خدا پرستی اور خدا
پر دینی ہے اور اسی میں فراغ خاطر کامل حاصل ہوتا ہے
اور یہی حقیقی تجرید ہے۔

فقط

[illegible]
[illegible]

سلطان احمد

رباعی عمر خیام

آنہا کہ بکام دل جہاں داشتہ اند
وانہا کہ جہاں بپاے تحریر انگیختہ اند
تو پنداری کہ جاودانی خواہی ماند
پیش از تو ہم ایشان چو تو پنداشتہ اند

صانع قدرت نے یہ آلہ بھی عجیب بنایا ہے دل کش آوازیں
مفید باتیں اسی کے ذریعہ سے دل نشین ہو جاتی اور روح
کی غذا بنتی ہیں سبحان اللہ قوتِ سامعہ بھی کیسی نعمتِ عظمیٰ ہے
خدا کی دی ہوئی نعمتیں سامعہ، باصرہ شامہ وغیرہ ایسی
ہیں کہ ایسی ایک نعمت بھی ایک انسان دوسرے کو نہیں
دیسکتا - آنکھ - کان - ناک - زبان - صانع قدرت کے
وہ آلات ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی بیکار ہو جائے تو
انسان کی قدرت نہیں کہ پھر اُس کو کارآمد بنا سکے -
اندھے کو چشم بینا - بہرے کو گوش شنوا - گونگے کو زبانِ
گویا - کیا انسان دیسکتا ہے؟ ہرگز نہیں - پھر تعجب ہے
کہ انسان ایسی اور اس سے بڑھکر بھی نعمتیں پاکر خدا کا
شکرگزار نہ ہو - ذرا سی بھی تکلیف پہنچے تو وہ اپنے خالق
اپنے رازق رؤف ورحیم غفور وکریم خدا کی شکایت اور وہ
بھی کس سے اپنے جیسے لوگوں سے کرنے لگے اور یہ نہ سوچے
کہ اس میں اُس کا اپنا قصور ہے یا اُس حکیم علی الاطلاق نے
ناحق ہی اُس کو تکلیف میں ڈالدیا ہے حالانکہ خدائے
عزوجل کسی کو تکلیف نہیں دیتا لایکلف اللہ نفساً الا
وسعہا اپنا انسان کو بایں فرماتے ولا تلقوا
بایدیکم الی التھلکۃ افسوس ہے کہ انسان راحت میں
تو خدا کے ذکر و شکر سے غافل رہے اور آفت و مصیبت میں اُس

وہ بھی جو اپنی طرف سے یا اپنے ہم جنسوں کی طرف سے پڑے تو
خدا کی شکایت کرے - سچ ہے ان الانسان لربہ لکنود
خدا نے انسان کو جتنے اعضا دئے ہیں اُن سے لذت حاصل
کرنے کے لئے دنیا میں ہزاروں نعمتیں بھی پیدا کر دی ہیں اور
اُن نعمتوں سے جائز لذت اٹھانے کا حکم بھی دیدیا ہے -
اپنے جسم کی راحت اپنی روح کی لذت - اور وہی خدا کا حکم بھی
اور شکر نعمت کرنے پر زیادہ عطا کرنے کا وعدہ بھی لئن شکرتم
لازیدنکم اور اس پر بھی حضرتِ انسان کفرانِ نعمت اور
خدا کی شکایت کئے جاتے ہیں سب کہنے - سننے - دیکھنے - اور کھانے
پینے کی بے حساب اچھی چیزیں موجود - مگر مائل ہونگے تو بری
چیزوں کی طرف جو تکلیف دینے والی عزت لینے والی ہوں
عقل رکھتے ہوں تو عقل والوں کی بات بھی نہیں سنیں گے
انسان ہوکر اپنے تئیں حیوانِ مطلق کی طرح بنا دیں گے اور پھر
سمجھیں گے کہ ہم بھی انسان ہیں واہ ری انسانیت "بریں عقل
و دانش بباید گریست" -

کان اور اعضا کی طرح چہرہ کی زینت ہے خصوصاً صنفِ نازک
کے کان تو ظاہری زیب و زینت کے کان زرہوتے ہیں اچھی
بالیاں - کرن پھول جھمکے - وغیرہ کان کی شان کو دوبالا
کرنے والے زیور ہیں بچوں کی تادیب وتنبیہ کے لئے بھی کان
کام لیا جاتا ہے یعنی گوشمالی یہ ایک طرح کی سزا ہے ہمارا بھی

۵

گوشمال آخر شود دستِ نوازش سازرا سرکش گر گوشمالی می دہد دوران ترا

تعلیم تعلّم کو کانوں سے جو مدد ملتی ہے ظاہر ہے۔ اگر عورتیں ظاہری زینت کی طرح باطنی زینت یعنی استماع وعظ و نصیحت کی طرف کان لگائیں تو زنانِ جہاں سے حورانِ جناں ہو جائیں مگر اکثر عورتیں زیور پہنکر اپنے کان کو کان زر سمجھتی ہیں اور بعض تو زیور کی کثرت سے پہنکر کانوں کی خوبی کو بگاڑ لیتی ہیں۔ یہ پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹے کان۔ عورت ہو یا مرد چاہئے کہ استماع مواعظ و نصائح سے کانوں کو کان زر بنالے۔

سن اے انسان! مواعظ و نصائح پر کان لگا۔

اے انسان! بری باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکالدے اور اچھی باتوں کو دلنشین کر۔

اے انسان! اگر بری باتوں کو سنکر دل میں جگہ دیگا تو ان سے جو نتائج نکلیں گے وہ تیری آبرو و تیری تباہی کا باعث ہونگے

اے انسان سن! جن باتوں کو سننا تو پسند نہ کرے انکو دوسرا کیوں پسند کرے۔

اے انسان! اچھی باتیں سنا اور اچھی باتیں سن۔

ع

ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے

اے انسان! خدا سمیع و بصیر ہے تیری ہر ایک بات کو سنتا اور تیرے ہر ایک کام کا دیکھتا ہے۔ اب تو جو کام کر یہ سمجھ کے کر کہ خدائے سمیع و بصیر حاضر و ناظر ہے۔

[illegible]

ایک طوفانی منظر

ایک انگریزی علم ادب کے مضمون کا خاکہ

(۱) رات قیامت کی تاریک زمین کو سہوں دور گھٹاٹوپ بادلوں میں لہریں مارنے والی بجلی دم گھونٹنے والے سیل ہوا کے جھکڑ متلاطم سطح سمندر پر مصیبت کی کڑی نظر لیے کر رہا تھا یہ حال زمانہ حال کی ایجاد نہ تھی کہ ضروریات زندگی ہے آرام برقی روشنی جلتی شیشوں میں بند چمکتے چاند کی خوشنما صورت پیدا کر لیتی تھی مسافرین عہد عتیق کے مسافر تعلقات دنیا سے بے تعلق [illegible] و آرام کے [illegible] دولت کے [illegible] بادۂ ناب میں مست عیش کی بہتات میں سرشار بنے تھے یہ وہ لوگ تھے جن کی عمروں کا زیادہ حصہ اس خدائی میں ناخدائی کرتے گزرا تھا خود ہی مسافر تھے اور خود ہی ملاح خود ہی آقا تھے اور خود ہی غلام۔ خود ہی بیمار اور خود ہی تیماردار ملکوں ملکوں تجارت کی دوا دوش میں دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھتے اور اپنے دست و بازو کے فیض سے یگانے تو یگانے بیگانوں کو بھی بے فیض نہ چھوڑتے تھے۔

رات آدھی سے کچھ زیادہ گزر چکی تھی جہاز منزل مقصود پر پہنچ
جانے قیام کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ دیو سیاہ ہوا کے تھپیڑے
میں گرج گرج کر برس رہے تھے۔ ابر گریہ باراں دیدہ ملاح ایک گھنٹہ کی
لگاتار بارش سے گھبرا اٹھے برفانی گولیوں کی مسلسل پڑنے والی
چادر نے دم بھر میں عالم موجودات کی کایا پلٹ دی تھی۔ تپیا
ہوا ہو کر اڑ گئیں جنگل صاف میدان خاک سے پاک ہو گئے۔
نالے ندیوں سے۔ ندیاں بڑھ کر سمندر سے ہمکنار ہوئیں۔
سمندر ابل ابل کر آنکھیں دکھانے لگا اربعہ عناصر کی اس جنگ
عظیم میں جاندار ہستی کا کیا ذکر ٹیلے پہاڑ بھی اس خوفناک ضرب
کی تاب سے بیتاب ہو گئے۔

(۲) طوفان ختم ہو چکا تھا رات کی سیاہی ڈھلکر سورج کی
چمکدار کرنیں نیلے آسمان پر دوڑنے لگیں تھیں منہ زور ہوا
اطمینان کی ہوا میں بھر رہی تھیں۔ اہل بستی جو رات بھر کی
متوحش حالت کا مقابلہ کرتے کرتے تھک چکے تھے ابھی بستر سے
الگ بھی نہ ہونے پائے تھے۔ کہ ایک تھراتی آلاف جہاز کی
آواز پردہ گوش سے ٹکرائی۔ سونے والے بستروں سے اچھل
پڑے اور بدحواسی کی مجنونانہ دوڑ شروع ہوئی۔ سب کنارے
آب کی طرف ایک دوسرے سے گوئے سبقت لیجانے کیلئے
بے تحاشہ بھاگ رہے تھے۔ خوف دلانے والی پرجوش سمندر
کی صورت رات بھر کی طوفان خیز جنگ کے بعد بھی خوفناک
تھی۔ لہریں سمت سمت کر سیاہ چٹانوں پر ٹکریں مارتی تھیں
اور غضبناک فیل مست کی طرح سنگیں اٹھا اٹھا کر پرشور آواز
سے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتی تھیں اور پھر تھک تھک کر
لڑھکتی گرتی اچھلتی اور دل گرفتہ ہو جاتی تھیں گھبراہٹ
اور پریشانی میں سمندر پر نگاہ پڑتی تھی جہاز کنارے سے

بالکل قریب سامنے تھا لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر
دیکھتے لیکن سیاہ لہروں کے اژدہوں اور ان کے جھاگ سے بھرے
ہوئے سفید منہوں کے سوا اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی ایک نیم
برہنہ ملاح نے جو نزدیک کھڑا تھا۔ انگلی سے اشارہ کیا۔ ایک
بے حس شکستہ جہاز دکھائی دیا جس کے ٹوٹے پھوٹے بازو بچے
کھچے۔ بادبان وحشت انگیز رسیوں کے ڈھیر ہوا میں پھڑپھڑا رہے
تھے اور بے رحم امواج کے رحم و انصاف پر جانکنی کے عالم میں
دم توڑ رہا تھا۔ درد انگیز غمگین صدائیں کنارے سے اٹھ رہی تھیں
جہاز لہروں کے عمیق غار سے موج کی سطح پر ابھرا چار شخص جو چپکے
بادبانوں کی رسیوں سے چمٹے ہوئے نفس آخری کے لئے جدوجہد
کر رہے تھے نظر آئے۔ ان میں کا ایک نوجوان جان عزیز
کے بچاؤ کے لئے مستول کی سب سے بلند چوٹی سے لپٹا ہوا۔
نظر حسرت سے اُن ہمجنسوں کو دیکھ رہا تھا جو کنار ساحل پر کھڑے
رفتگان آب کا مشاہدہ کر رہے تھے جہاز لہروں کی تھپیڑ سے
سراسیمہ طوفان ہوا سے بدحواس۔ ادھر ادھر بھاگتا اور دریا
میں اچھلتا کودتا پھرتا تھا مگر عذاب آخرت سے رہائی نہ ہوتی
تھی موج ہوا سے جہاز کی گھنٹیاں بج رہی تھیں اور بد قسمت
انسانوں کا پیام ہے

مرا در منزل عشرت چہ امن و عیش چوں ہر دم
جرس فریاد می دارد کہ بربندید محملہا

ہم تک پہنچ رہا تھا۔ دل دھڑک رہے تھے موجیں اچھل اچھل کر
اپنے شکار پر حملہ کر رہی تھیں بچے چیختے عورتیں حالت کرب میں
مٹھیاں دبائے چپکے چپکے رو رہی تھیں کچھ مرد دنگ کھڑے دیکھ
رہے تھے کچھ دل ہی دل میں ایک دوسرے سے مدد کے لئے خوشامد
کر رہے تھے گو مدد پہنچانا [illegible]

رموزِ بیخودی | یعنی حیاتِ ملیہ اسلامیہ مصنفہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے بیرسٹر ایٹ لا، لاہور۔

ہم نے اس کے ایک ایک شعر کو بنظر غور و تعمق پڑھا۔ پوری کتاب رموز و اسرار کا گنجینہ ہے ہم اس پر کیا لکھیں اس کے مصنف کا نام خود اس کی خوبیوں کا ضامن ہے۔

اس مثنوی میں ملتِ اسلام کے حیات بخش اسرار کو بیان کر کے اُن تاریک راہوں میں مشعل جلائی ہے جہاں چشمۂ حیات اس وقت پنہاں ہو رہا ہے اس زمانہ میں اسی کی ضرورت ہے کہ کوئی شخص اس آگ کو جو ہماری بے التفاتیوں کی وجہ سے راکھ میں دبی ہوئی ہے آہستہ سے پھونک دے تاکہ وہ پھر روشن ہو جائے اسلام کوئی جدید بات نہیں چاہتا بعضوں نے نادانی سے کہئے یا خود غرضی جانئے اس میں نئے نئے گل کھلائے اور اس کو بدصورتی سمجھنے لگے کسی گلشن کے اصلی درختوں کو خزاں سے مرجھایا ہوا دیکھ کر ان کی آبیاری کرنا اور ان کی موجودہ خوبیوں کو نمایاں کرنا چاہئے نہ یہ کہ ان درختوں کے عوض دوسرے پودے لگا کر گلشن کو نقش بگاڑ دو اور وہ بھی اس سرزمین کے جن سے ہم نا آشنا اور ناواقف ہیں بہرحال ہمارے مقاصد کے منافی کسی آئینہ کا زنگ دور کرنے میں جو فائدہ و منافع مد نظر ہے اس پر نقش و نگار بنانے سے وہ بات کبھی حاصل نہیں ہو سکتی غرضیکہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ [illegible] اور

لائق تقلید ہے ؂

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید | کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

اب ہم بعض مقامات نمونے کے طور پر اس مثنوی کے کچھ شعر پیش کرتے ہیں جس سے ناظرین کو ڈاکٹر صاحب کی طلاقت لسانی اور زور طبیعت کا اندازہ ہو سکے گا اور معلوم ہو جائیگا کہ عارف رومی کی مثنوی کا مطالعہ اور میرزا بیدل کے صوفیانہ طرز انشا کا تتبع ایک طبع وقاد کو کیسا روشن کر دیتا ہے چنانچہ مثنوی کی ابتدا میں اپنے متعلق تحریر فرماتے ہیں ناظرین انداز بیان کو ملاحظہ کریں خصوصًا تیسرے شعر کا مصرع ثانی داد طلب ہے ؂

از سخن آئینہ سازم کردہ اند | وز سکندر بے نیازم کردہ اند
بار احساں بر نتابد گردنم | در گلستاں غنچہ گردد دامنم
سخت کوشم مثلِ خنجر در جہاں | آب خود می گیرم از سنگ گراں
بر دو رنگ شیشہ نشکستم | صید ہر موجے [illegible] نسیم
در سرا آبادِ ہستی اخگرم | خلعتے [illegible]

شعر چہارم کی بندش بھی ملاحظہ طلب ہے۔

پھر اسی سلسلے کے ضمن میں لکھتے ہیں ؂

اشکِ خود بر خویش می ریزم چو شمع | با شب یلدا در آویزم چو شمع
جلوہ می افزودم و خود کاستم | دیگراں را محفلے آراستم

ان دونوں شعروں کو پڑھئے اور لطف اٹھائیے

جھاڑ، چنپا، چنبیلی، کیسر، مولسری کا ذکر سنکر ہو سکتا ہے۔

ہم بعض بعض مقامات سے کچھ شعر ناظرین کی تفریح طبع کیلئے درج کرتے ہیں جن سے حسن تخیل اور خوبی بندش دونوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

جنگل اور ندی کا کیا دلفریب سماں لفظوں میں دکھایا ہے ؎

پھولوں سے دشت ہوگا سارا چمن　　ان کی خوشبو سے مور ہونگے مگن
راہ ان کے وہ بتائیں گے　　ناچ کر تجھکو وہ رجھائیں گے
بگلوں کی جب قطار اڑیگی وہاں　　کیا کہوں ہائے تجھ سے میں وہ سماں
ہیں وہاں ارجن اور مولسری　　مست ہیں جو خوشبو سے انکی بسی
موروں کی کچھ عجب ادائیں ہیں　　دل کش ان کی مگر صدائیں ہیں
مور پھولے نہیں سمائیں گے　　ہونگے باہر وہ اپنے جامے سے
اپنی مادہ کو وہ رجھائیں گے　　مست ہو کر ادھر وہ جائیں گے
جب خمیدہ کریں گے اپنا تن　　دم سے لگ جائیگی وہیں گردن
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے وہ جھونکے　　گرم ارجن چنبیلی سے ہیں بسے

محبوبوں کی تعریف میں چند اشعار ہم مختلف مقامات سے نقل کرتے ہیں ؎

واں جواں عورتیں نہاتی ہیں　　ٹینہ کیسر کا وہ لگاتی ہیں
کانوں کی لو میں کند کی کلیاں　　کتنا پیارا دکھائیں گی وہ سماں
پھول ہلکے ہیں جو چنبیلی کے　　ہیں لڑی بن کے چوٹیوں میں گندھے
پھول نیلے ہیں کمل کے جو چمپہ کے　　چشم مشتاق کو بھاتے ہیں یہ پھول
جب پپیہے کا وہ سنیں گے شور　　اور کم ہوگا بس دلوں کا زور
پی کہاں پی کہاں کی سن سنکر　　دونوں ہاتوں سے تھام لیں گے جگر
[illegible]　　جو نہ چاہے انہیں خدا کی مار
بالیاں ان کی موتیوں سے بھری　　گویا اپنے مقام پر ہیں پری

کیتکی اور کمل کے پھولوں سے　　تازے تازے وہ ہار ہیں گوندھے
پھولوں کی بالیاں ہیں کانوں میں　　شور ہے ان کا داستانوں میں
بالوں کو وہ سمیٹ کر اک بار　　جوڑے باندھیں گی وہ پری رخسار
نظر آئے گا بجلی کا جگنو　　جھومنے میں وہ ہوگا زیب گلو
اس پہ قوس قزح کی پھر ہیکل　　دیکھنے والوں کو نہ آئے کل
چھیڑ دینے ہوا کے آخر کار　　سرکے گا آنچل ان کا سو سو بار
اس سب سے عجب نہیں دیکھیں　　گنگا جمنی گلوں کی زنجیریں
لال کندرو کی طرح ہیں وہ لب　　در دنداں ہیں پاک صنعت رب

ترجمے کے سوا جہاں جہاں مصنف نے اپنے ذاتی خیالات ظاہر کئے ہیں وہ بھی بلند ہیں۔ چنانچہ دیباچہ اور دو ساقی نامے اس کے شاہد عدل ہیں:۔

لیکن اس کے ساتھ مصنف کو ان کی رنگین بیانوں نے ایسا محو کر رکھا کہ بعض امور میں قواعد و اصول فن شعر اور محاورۂ زبان کے خلاف عمل کرنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ ان میں سے بھی بعض شعر ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:۔ ؎

دل کش ہر ایک رنگ ہے اسکا　　خوشنما گل ہے سنگ ہے اس کا

اس شعر کے پہلے مصرع میں ہر ایک کی ہا تقطیع سے ساقط ہے ؎

چھوٹی چھوٹی ادھر ادھر ندیاں　　کچھ نیا ہی دکھا رہی ہیں سماں
جب چلے نربدا ندی سے تو　　ہو مبارک سفر یہ اے خوشخو
اس ندی کی بھی چال انوکھی ہے　　کھا کے بل مست چال چلتی ہے
چلتی ہے زور سے ہوا جو شتاب　　اٹھتی ہے تب ندی سے چادر آب

ان تمام شعروں میں ندی بر وزن بدی خلاف محاورہ ہے ؎

بنگ پہ وندھیا کے جنگل میں　　اجلا ہو نہ سیاہ کمبل میں

اس کے مصرع ثانی میں پیا پوند کی ہ الف تقطیع سے ساقط ہو گئی یا سیاہ کی ی ؎

یہ دھواں محلوں کا جھکو رہے ۔ پیچ کھا کھا کے باہر اُٹھتا ہے
جب چمکتے چمکتے برق تھکے ۔ تجھکو آرام بھی تو لازم ہے
جب کہ یہ تنگ و تار راہ ہو طے ۔ پھر تو چاہیے مجھے قرار ملے
چوٹیوں کو چھپائے برف میں ہے ۔ کیوں کمل کا نہ پھول شرمائے
کیوں نہ ہم رنگ ہو کے تجھ سے ۔ تیری تہ میں بھی تو سفیدی ہے
میری الفت کی آگ اگر بھڑکے ۔ اُس کو لازم تجھے دبانا ہے

ان تمام اشعار میں ہے اور ے وغیرہ قافیہ غلط ہے اس لئے کہ ان کے ماقبل ایک جگہ مکسور ایک جگہ مفتوح بغیر حرف وصل صحیح نہیں ہے اسیطرح اس شعر میں ؎

سنگ مرمر جڑا ہے صحنوں میں
ماند جن کی چمک سے ہیرے ہیں

ہیں اور ہیں قافیہ صحیح نہیں ہے ؎

سادہ دل لڑکیاں جو ہیں کنواری ۔ باتیں اُن کی تو ہوتی ہیں پیاری
عورتیں کنواری لئے خوش جب جائیں ۔ للچا للچا کے کیا عجب رہ جائیں
پاک پانی ہے یوں ہے وہ شفاف ۔ کنواری کم سن کا دل ہو جیسے صاف

ان اشعار میں کنواری بروزن فعلن موزوں ہوا ہے۔ جو بروزن فعولن چاہئے ؎

وہاں پر باگ کا سماں ہوگا ۔ گنگا جمنا کا رنگ عیاں ہوگا

اس کے مصرع ثانی میں عیاں کی ی تقطیع سے ساقط ہے ؎

بھاگنے کی کریں گے وہ کوشش ۔ اُڑ گئی ہو گی اک انہیں کاہش

اس شعر میں کوشش کا قافیہ کاہش غلط ہے ؎

ہے یہ جو ش موسم برسات ۔ خوش ہیں سب اپنی پیا ری کے ساتھ
اور بھی اک مرن کی ہے یہ بات ۔ زندہ دل ہے یہ موسم برسات

یاد ہیں طور چشم و چتون کے ۔ ہے مشابہ وہ آنکھ ہرنی سے

اشعار بالا میں موسم برسات اور چشم و چتون غلط ترکیبیں ہیں ایک فارسی اور ایک ہندی لفظ کے درمیان عطف و اضافت صحیح نہیں ہے ؎

نخل کہنہ سے بیٹھ کر کڑیں گے ۔ گرجنے کا جواب وہ دیں گے

اس کے مصرع ثانی میں گرجنے کی (ر) ساکن ہو گئی ہے اگر (ر) کو متحرک پڑھیں تو وزن جاتا ہے ؎

سانسیں ٹھنڈی بھرے نہ کیونکر وہ ۔ جو کلیجہ مسوسے بیٹھے ہو

وہ کے ساتھ ہو قافیہ نہ کرنا چاہئے ؎

آنکھیں ہیں لا کلام متعجب ۔ چشم آہو پہ رنگ ہے غالب
جب ہو متوجہ تجھ سے وہ خوش رو ۔ میری باتوں کو کہہ گزرنا تو

ان دونوں شعروں میں متعجب اور متوجہ کی (ت) ساکن نظم ہو گئی ہے جو غلط ہے اگر اس کو متحرک پڑھیں تو وزن جاتا ہے ؎

تیری پتلی بھی وہ بناتا ہے ۔ آنسوؤں سے اُسے نہلاتا ہے

نہلا تا چلا تا کے وزن پر نہیں بہلاتا کے وزن پر چاہئے۔

لکھائی چھپائی کاغذ سب اچھا ہے قیمت ایک روپیہ مناسب ہے علی گڈھ انسٹیٹیوٹ پریس سے درخواست کیجئے۔

تذکرۃ الحبیب | مولفہ جناب مفتی محمد انوار الحق صاحب ایم اے ڈائرکٹر تعلیمات بھوپال۔ اس کے متعلق صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ ذکر الحبیب حبیبؐ اسلام کے بہتر فرقوں میں کوئی فرقہ ایسا نہ ہوگا جو اس کو محبت کی نظر سے نہ دیکھے۔ فائدہ کے لحاظ سے مسلمانوں کے لئے تعلیم و تلقین کا اس سے بہتر کوئی رہنما نہیں ہو سکتا جیسا کہ خود مولف نے تحریر فرمایا ہے:۔

"صرف زبانی نصیحت پر عمل کرنا زیادہ شاق ہوتا ہے
اگر وہی بات کسی واقعے کے پیرایہ میں بیان کی جائے
تو اس پر عمل کرنا زیادہ آسان ہو جاتا ہے":

جنابِ مفتی صاحب کا یہ قول بھی گوش ہوش کا آویزہ بنانے کے قابل ہے:-
"کیا یہ غیرت کی بات نہیں ہے کہ اسوۂ حسنہ نبوی کے ہوتے ہوئے بھی ہم حسن معاشرت میں غیروں کے نمونوں کو اپنا نصب العین بنائیں"۔

یہ قول بالکل درست ہے جس کے اخلاق کی لوح طغرائے انک لعلیٰ خلق عظیم کے عنوان سے مزین ہو اس کو چھوڑ کر دوسروں کے اخلاق کو نمونے میں پیش کرنا آفتاب کے آگے شمع جلانا اور ماہتاب کے روبرو آئینہ دکھانا ہے۔

ہم تمام مسلمانوں کو اس متبرک کتاب کے پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ہر مسلمان کے گھر میں اس کی ایک جلد ضرور رہے۔ ان تمام مفاد اور خوبیوں کے مقابل میں اس کی قیمت صرف (۱۲) بہت کم ہے ع

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

ایڈیٹر

کلام شاد

ہز اکسیلنسی راجہ راجایان سر کشن پرشاد مہاراجہ بہادر یمین السلطنت جی سی آئی ای

(شاد با القابہم)

اُسے وصال میں مجھ سے کشیدہ ہونا تھا
مرے نصیب میں اک خود رسیدہ ہونا تھا

پسِ فنا بھی مری خاک ہی گلی میں تری
فلک زدہ کو یہیں آرمیدہ ہونا تھا

ہمیشہ عشق کے جوہر شناس کرتے قدر
گہر کی شکل میں اے آب دیدہ ہونا تھا

ابھی جہان میں کھلتا بھرم قیامت کا
ذرا تو اے قدِ جاناں کشیدہ ہونا تھا

مثالِ سبزہ نہ پامال کیوں کئے ہوتا
کہ مجھ کو بعدِ فنا پھر دمیدہ ہونا تھا

مثالِ تیر جو سرکش تھے وہ سمجھتے ہیں
ہمیں کمان کی صورت کشیدہ ہونا تھا

حسد کی وجہ سے بے برگ و بار ہو گا
ترے نصیب میں شاخِ بریدہ ہونا تھا

مرید پیرِ مغاں کس لئے نہ ہوتا شاد
شرابِ عشق کا لذت چشیدہ ہونا تھا

مقالات حمید

مختصر مرحلۂ طولِ اَمل کیا ہوگا
قطع یہ سلسلہ بے تیغ اجل کیا ہوگا

دور کر تیرگیِ دل کہ ابھی تک ہے وقت
ہو گئی صبح تو روشن یہ کنول کیا ہوگا

حرکتِ چرخ کی بس تیرے ہی آہنگ سے ہے
ورنہ بے صوتِ حُدی رقصِ جمل کیا ہوگا

چاہئے گوشۂ دل وادیِ ایمن ہو تو ہو
جلوہ زا اُس کا بھلا دشت و جبل کیا ہوگا

دے رہا خال ہے جو حسن در گوش کے پاس
پہلوئے زہرہ میں رخشندہ زحل کیا ہوگا

بیٹھے ہیں گوشۂ عزلت میں ہم اب تو کے پالو

ہاتھ منتِ کشِ ارباب و دل کیا ہوگا

دیکھتا ہوں کبھی حسرت سے تو کہتا ہے وہ شوخ
مجھکو تو دیکھ کے جلتا ہے تو جل، کیا ہوگا

جب میں کہتا ہوں چلو ترکِ محبت ہی سہی
اس پہ وہ ناز سے کہتا ہے کہ جل، کیا ہوگا

نظمِ اکبرؔ آنی و فانی ہے پھر اس سے نازاں
خالقِ لم یزل و عز و جل کیا ہوگا

آنکھ پھرنے میں جو رنجش کا نہ پہلو ہوتا
مجھ کو آہو سے زیادہ رمِ آہو ہوتا

حسرت و درد کو کچھ اور جگہ مل جاتی
کاش کے دل سے بھی خالی مرا پہلو ہوتا

جیسا رسوائیوں کا ہے مرے رونے پہ ہجوم
ایسا میلا بھی الٰہی نہ لبِ جو ہوتا

پر خطر تھی شبِ ہجراں کی سیاہی ایسی
نکل آتا بھی جو دن سہم کے جگنو ہوتا

میرے نالے جو شبِ تار کو سمٹا لاتے
صبحدم چہرۂ خورشید پہ گیسو ہوتا

ہم دکھا دیتے کہ یوں دب کے نکلتا ہے چاند
بام پر سر کو جو نیوڑھائے ہوئے تو ہوتا

سرمہ بھی دیدۂ فتاں میں لگانا تھا ضرور
ساتھ آہو کے غبارِ رمِ آہو ہوتا

کھنچ آئے جدھر ہم کو دلِ زار نے کھینچا
جیسے کسی مجبور کو مختار نے کھینچا

نقشہ نہ کھنچا خوابِ پریں کا کسی سے
کھینچا تو مرے دیدۂ بیدار نے کھینچا

چھپ چھپ کے بھی رویا تو گنہگار ہوا میں
محشر میں گریباں غمِ دلدار نے کھینچا

جب آہ کی آثارِ سحر کے نظر آئے
گردوں کی طنابوں کو دلِ زار نے کھینچا

سولی نظر آئے گی مسیحا کو فلک پر
نالہ جو کسی دن ترے بیمار نے کھینچا

کن کن ثمروں کو قدِ موزوں نے سنبھالا
کس بوجھ کو موئے کمرِ یار نے کھینچا

میرا دلِ پُر داغ ہے افشاں کا ستارہ
کاکل سے رہائی ہوئی رخسار نے کھینچا

لی ابرِ بہاری نے پرِ زاغ کی رنگت
نقشہ دمِ طاؤس کا گلزار نے کھینچا

ایسی ہے ترے ہاتھ کے بوسوں کی تمنا
اس شوق میں چلّہ لبِ سوفار نے کھینچا

کیا کیجئے اے نالہ کہ صیاد تھا حائل
ہم کو تو بہت نکہتِ گلزار نے کھینچا

حیدر یار جنگ طباطبائی

رباعی خیام

ساقی قدحے کہ گہہ بتاں ناز کنند — مستاں بہ نیاز کار خود ساز کنند
چنداں بدرِ میکدہ سر خواہم زد — کز غیب درے بروئے من باز کنند

نصیحتوں کے موتی

تھا ملکِ حبش کا ایک سلطاں　　نامی تھا دلیر تھا وہ ذیشاں
تلوار کا بجت کا دھنی تھا　　ملک و زر و قوم سے غنی تھا
یکتائے زماں دلاوری میں　　دریا دل تھا بہادری میں
تھی فوج کے اُسکی یوں روانی　　جیسے بہتا ہوا ہو پانی
طوفان کی طرح جدھر کو آیا　　بستی کو صاف کر دکھایا
موجوں کی طرح جو فوج آئے　　ندی اک خون کی بہائے
جن جن کے سرکشوں کو مارا　　تلوار کے گھاٹ اُنہیں اتارا
پل لاشوں سے آن میں بنایا　　جو منہ سے کہا وہ کر دکھایا
ہے شکل حباب زندگانی　　دنیا ہے بے ثبات و فانی
پیغامِ اجل جو اُس کو آیا　　فرزند نے تاج و تخت پایا
بچپن میں یہ آرزو بر آئی　　شاہی فضلِ خدا سے پائی
والد کا اُٹھا جو سر سے سایا　　اللہ نے حکمراں بنایا
دن رات تھا عیش کا ترانا　　طبلہ کی تھاپ ناچ گانا
کہنا نہ کسی کا اُس نے مانا　　لٹنے لگا مفت کا خزانا
دربار سے کچھ غرض نہ کچھ کام　　عشرت میں تھی صبح عیش میں شام
مرضی کے خلاف جس کو پایا　　اُس کا سر تیغ سے اڑایا
ضد کے باعث پھر از زمانہ　　بیگانہ ہوا ہر اک یگانہ
مخلوق خدا بھی سب پریشاں　　حیران گریہ کناں و نالاں
کہنے سننے پہ بس یقیں تھا　　جو کہہ دیا جس نے دل نشیں تھا
توفیق نیک آئے خدا دے　　تحقیق سے پہلے جو سزا دے

خلقت میں بے محل تھا غصہ　　تھا آگ کا جزو کچھ زیادہ
صحبت بھی ہمسنوں کی دن رات　　کرتا نہ تھا وہ وزیر سے بات
پروا کچھ نہ فوج کی نہ زر کی　　تھی اُس کو خبر نہ اپنے گھر کی
دن رات تھا بس شراب سے کام　　پریوں میں بنا ہوا تھا گلفام
عہد اول کا یہ بیاں ہے　　آخر کی عجیب داستاں ہے
عاقل تھا وزیر جو پرانا　　دیکھے ہوئے تھا! وہ اک زمانا
خاموش تھا اپنی جا پہ وہ پیر　　رہتا تھا رات دن وہ دلگیر
آیا سیلاح اک قضارا　　دیوان نے اپنے گھر اتارا
آیا جب وہ وزیر کے گھر　　دیکھا اُس کو بحالِ مضطر
رنج و افسوس میں جو پایا　　قصہ دلچسپ اک سنایا
پھر زاغ و ہما کی حکمرانی　　دلچسپ سنائی اک کہانی
بولا یہ وزیر پاس آؤ　　کچھ تجربہ اپنا تو سناؤ
اُس نے کی عرض ہو جو فرصت　　سُن لیجئے کچھ مری نصیحت
عاقل نے کہا کہو بصد شوق　　مشتاق ہے دل میرا بصد ذوق
بولا سیلاح مرد عاقل　　دشمن سے رہے کبھی نہ غافل
سچے دل سے جو مہرباں ہو　　ہو جائے فدا جو قدرداں ہو
اس میں ہے ہر طرح کی ذلت　　مغرور کو ہے عبث نصیحت
وہ دوست نہ جس میں کچھ وفا ہو　　الفت نہ ہو مگر ہو دغا ہو
وہ شخص کہ جس میں خود سری ہو　　وہ امن نہ جس میں کچھ خوشی ہو
وہ قول جو فعل سے جدا ہو　　وہ خلوت نہ جس کی انتہا ہو

بس میں او صاف سب پاؤ — اُس کی صحبت سے ہاتھ اٹھاؤ — عاقل نے دیا خوشی سے انعام — ٹھہرایا اُسے پئے عیش و آرام

ان سب سے کرو سدا کنارا — عاقل کو بس ہے یہ اشارا — تشریح طلب ہیں سب مقولات — قصہ ہے ایک ایک ہر بات

ہر امر میں ہو بخیر نیت — لازم ہے بشر میں آ و میت — جس کے دل میں خیال آئے — کر کے تشریح وہ بتائے

جس مال میں ہو نہ خیر و برکت — قاروں کی طرح وہ جائے غارت — فرصت نہیں اس لئے ہوں مجبور — خود ہی ہے اختصار منظور

بس ختم کیا کلام اُس نے — پیدا کیا سب میں نام اُس نے — کر حق سے دعا عدیلِ ناکام — اللہ کرے بخیر انجام

عدیل بلگرامی

رات کے پچھلے پہر طاؤس کی پکار

محبت لالہ و گل کی جو تھی دل میں وہ کام آئی
پرِ طاؤس پر آخر وہی نقش و نگار آیا

ہائے کیا آواز تھی کیسی تھی یہ پیاری صدا
تار کی صورت تری موجوں میں ہیں نغمے ہزار

جس نے مجھکو خواب سے چونکا دیا تڑپا دیا
پھر میں سننا چاہتا ہوں وہ نوائے دلفریب

اُس کے نغمے صبحگاہی بھی جی بھر کر سُنے
پھر ذرا پہنچا دے مجھ تک وہ صدائے دلفریب

لے اُڑا فوراً نسیمِ صبح کا جھونکا اُسے
مشرق کی جانب سے آئی پھر ہوا مستانہ وار

نیند کا ماتا نہ سمجھا میں کہ کیا آواز تھی
اور وہی ہمراہ اپنے لیکے صوتِ خوشگوار

نغمۂ جاں سوزِ مطرب یا صدائے ساز تھی
ہائے یہ آواز ہے طاؤسِ رقصاں کی پکار

کونسا طائرِ الٰہی یہ ترنم ریز تھا
جس کو سنتے ہی مرا دل ہو گیا پھر بیقرار

جس کا نغمہ ایسا حسرت خیز درد انگیز تھا
سُن لیا ہے جب سے میرے لب پہ آہِ سرد ہے

اے نسیمِ روح پرور تو ہے غمازِ چمن
ہائے اس آواز میں کیا لوچ ہے کیا درد ہے

تو ہی کہدیتی ہے ہم سے آکے سب رازِ چمن
میرے پیارے مور بتلا کس لئے نالاں ہے تو

ساز کے مانند ہیں تجھ میں صدائیں بیشمار
ہائے تجھ پر کیا بنی ہے کس لئے گریاں ہے تو

رقص کرتے کرتے کیوں ہو کر حزیں روتا ہے تو
آنسوؤں سے اپنا منہ کس واسطے دھوتا ہے تو
داغ ہیں کیا دل میں بھی تیرے ذرا بتلا تو مجھے
کیوں یہ کیسی آہ و زاری ہے ہوا کیا ہے تجھے
صبح ہونے میں ابھی کچھ دیر ہے اے بیقرار
چاند ابھی ڈوبا نہیں تارے ابھی ہیں آشکار
نیند میں ہیں بلبلیں اور خوابِ نوشیں میں گلاب
سرو پر قمری ہے آموں پر ہے کوئل محوِ خواب
سو رہے ہیں سب کے سب غفلت میں ہے [illegible]
دیتی پھرتی ہے نسیم صبح سب کو لوریاں

پر تجھے یہ کیا ہوا ہے ہو گیا بیدار کیوں
سب تو ہیں آسودہ راحت سے ہے تو بیزار کیوں
ہاں میں سمجھا کس نے سوتے سے جگایا ہے تجھے
ہائے شاید دردِ الفت نے ستایا ہے تجھے
آہ کر کے رو رہا ہے کیا اُسی کی یاد میں
جس نے یہ تاثیر بھر دی ہے تری فریاد میں
ہے اگر ایسا تو سب عشاق میں اول ہے تو
سب پرندوں میں بفضلِ عشق اکمل ہے تو

میر سعادت حسین نجیب

قناعت

ہے قناعت کی بدولت مجھے دولت حاصل
زندگی راحت و آرام سے ہوتی ہے بسر
نہیں پھیلاتا ہوں میں ہاتھ کسی کے آگے
پاؤں پھیلاتا ہوں اُتنا ہی ہو جتنی چادر
مجھکو غنچے کے چٹکنے سے یہ آتی ہے صدا
ہے وہ کافی مری مٹھی میں ہے تھوڑا سا جو زر
سرو کی طرح سے ہوں باغِ جہاں میں آزاد
میں جو بیکار ہوں کچھ بار نہیں ہے مجھ پر
کھل گیا علمِ قناعت سے مرے دل پہ یہ راز
خاک اکسیر ہے اور لعل و گہر ہیں پتھر
سنگ ہوتا ہے سدا [illegible]

قطرۂ آب بھی ہے میری نظر میں گوہر
جب سے ہے قافِ قناعت پہ تسلط مجھکو
نہیں کرتا میں کبھی ملکِ سلیماں پہ نظر
نہیں رکھتا ہوں ضرورت سے زیادہ زر و مال
راہ زن کا ہے مجھے خوف نہ ہے چور کا ڈر
رات کو چین سے بستر پہ ہوں سویا کرتا
دن کو آرام سے رہتا ہوں میں بے خوف و خطر
میں نے چاہا نہ کسی کا بھی زوالِ نعمت
نہ کبھی رشک و حسد مجھکو ہوا اوروں پر
نہ کبھی اپنی بڑائی کا مجھے آیا خیال
کی کسی پر نہ کبھی میں نے حقارت سے نظر

کبھی مال کی قلت سے ہوا میں غمگین
نہ زیادہ کی تمنا میں ہوا میں مضطر
گر ملا مجھکو زیادہ تو کیا شکر خدا
کم جو پایا تو ہوئی صبر و قناعت میں بسر
اس اوڑھ لیں اس کو تو پھر نہ آجائے
میرا کمل ہے دو شالے سے کہیں بڑھ چڑھ کر
پل کے دنیا کا زر و مال بھی مفلس ہے جم ایمن
فرد قانع ہے غنی گو کہ نہ ہو دولت و زر
لے گیا کچھ بھی نہ حسرت کے سوا اپنے ساتھ
ہاتھ خالی ہی زمانہ سے اٹھا اسکندر
چشم عبرت ہے جہاں میں ہوں میں نظارے ہوس
اس کے انجام پہ ہردم مری رہتی ہے نظر

ایڈیٹر

جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

کیسے پچتائے ہم آنکھوں میں ٹھہرنے کیلئے
پاؤں پھیلاتے ہیں اب دل میں اترنے کیلئے
آنکھیں ساقی کی سلامت مرے دشمن ترسیں
دھرے پیمانے ہیں نیت مری بھرنے کیلئے
کس مسیحا کی ہے مقتل میں الٰہی آمد
موت بھی آج مری جاتی ہے مرنے کیلئے
اس کی پلکیں ہیں غضب اس کی نگاہیں آفت
کتنے نشتر ہیں رگِ جاں میں اترنے کیلئے
کھینچکر شکل مری دنگ ہے نقاشِ ازل
رنگ ملتا نہیں تصویر میں بھرنے کے لئے
پھوٹ کر روئے ہم اشکوں کی پریشانی پر
کیا خبر تھی کہ یہ موتی ہیں بکھرنے کے لئے
شوخیوں سے نگہِ ناز کہیں رکتی ہے
چلتے جادو ہے کہیں کون ٹھہرنے کے لئے
میرے مرنے کی خوشی کیوں ہے قیامت ہے قریب
زندہ ہو جاؤں گا پھر آپ پہ مرنے کے لئے
کوئی بن ٹھن کے اٹھائے مرے گھر آنے کو
بگڑے بیٹھے ہیں نصیب آج سنورنے کے لئے
دل میں آنے کی جو سوجھی تجھے اڑنے مجھ سے
وہ پری بن گئے شیشے میں اترنے کے لئے
قیس و فرہاد کے بعد آپ غنیمت ہیں جلیل
جیتے جی یار پہ سو جان سے مرنے کے لئے

مولوی لطیف احمد صاحب اختر مینائی

اُن کے خرامِ ناز کا چرچا ابھی سے ہے
یہ حشر و سرائے جو برپا ابھی سے ہے
چھوٹے سے قد پہ چال قیامت کی پائی ہے
عمرش دراز باد وہ فتنا ابھی سے ہے
ہاتھ اُس نے دل پہ جام سے رکھا نہیں ابھی
سینے میں ہاتھ بھر کا کلیجا ابھی سے ہے
تلوار لی نہیں مرے قاتل نے میان سے
میری حیات و موت میں جھگڑا ابھی سے ہے
کمبخت دن بھی ہجر کا اب تک ڈھلا نہیں
صبح شبِ وصال کا دھڑکا ابھی سے ہے
صیاد دام لیکے جب آئے گا آئے گا
میرے گلے میں عشق کا پھندا ابھی سے ہے
آنکھیں تمہاری قہر کریں گی شباب میں
چتون تو دیکھو دل کا تقاضا ابھی سے ہے
پایا تھا نام لیلی و مجنوں نے بعدِ مرگ
میرے تمہارے عشق کا چرچا ابھی سے ہے
گو ابتدائے عشق ہے لیکن زہے نصیب
اختر کسی کی آنکھ کا تارا ابھی سے ہے

مولوی سید ارشد علی صاحب لمعہ

دیکھے تو کوئی حوصلہ اربابِ وفا کا
خود اُس کو سکھا دیتے ہیں انداز جفا کا
کیا اُس بتِ کافر کو سزا ملتی ہے دیکھیں
سنتے تو ہیں ہم نام بہت روزِ جزا کا
باقی نہ زلیخا نے رکھا آنچ کا پردہ
پیوند ہو گیا حضرتِ یوسف کی قبا کا
راہ و روش دھر سے واقف میں نہیں ہوں
رہزن پہ بھی دھوکا ہے مجھے راہنما کا
اللہ کرے خیر ہے بے وقت اشارہ
غمزے کو کرشمے کا کرشمے کو ادا کا
خاتم کوئی پہنے تو سلیماں نہیں ہوتا
موسیٰ نہیں ہوتا ہے جو مالک ہو عصا کا
کیا پوچھنے آئے ہو مرا حال ستمگار
جیتا ہوں بہر حال مرا احسان خدا کا
الٹے وہ پھرے ہیں مرے دروازے تک آکر
انداز ہے دیتا ہے نقشِ کفِ پا کا
مانا کہ نہ تھا میں کرم و رحم کے قابل
اتنا تو سمجھنا تھا کہ بندہ ہے خدا کا
اے لمعہ گناہوں کو میں ڈھانکوں گا اسی سے
دامن ہے مرے ہاتھ میں اب آلِ عبا کا

مرزا فدا علی صاحب خنجر لکھنوی

دل جائے تو جائے دل جانے کو کیا کہیے
وہ خوش ہیں تو سب کچھ ہے غم کھانے کو کیا کہیے
اظہارِ محبت پر یوں ہنسکے کہا اُس نے
دیوانہ ہے بکتا ہے دیوانہ کو کیا کہیے
کچھ یاد ہے وہ شوخی جب دل مرا چھینا تھا
اب بیٹھ کے پہلو میں شرمانے کو کیا کہیے

ہم تشنہ لب آئے تھے تشنہ ہی چلے ساقی
اس جام کو کیا کہئے میخانے کو کیا کہئے

اس حسن کی گرمی سے اس سوز محبت سے
خود شمع جلی شب بھر پروانے کو کیا کہئے

کچھ حسن کے جھگڑے ہیں کچھ عشق کے قصے ہیں
عالم ہے جوانی کا دل آنے کو کیا کہئے

اب ذکرِ جفا کرکے دل ان کا دکھانا ہے
گزری ہوئی باتیں ہیں افسانے کو کیا کہئے

تو دل کے تعلق سے واقف ہی نہیں ناصح
اے مشفق من تیرے سمجھانے کو کیا کہئے

اک بوند نہیں دل میں خون آنکھوں سے کیا برسے
پیمانہ تو پیمانہ میخانے کو کیا کہئے

اب چھپ کے بتوں سے تم بیٹھو گے کہاں خنجر
کعبہ بھی ہے گھر ان کا بتخانے کو کیا کہئے

مرزا محمد بہادر صاحب ایڈوکیٹ ہائیکورٹ

ضعف سے لب پہ نہ اک حرفِ تمنا پہنچا
ہائے کس وقت میں بالیں پہ مسیحا پہنچا

سارے عالم میں ترے حسن کا چرچا پہنچا
ذکر تیرا ہی سنا خلق میں جس جا پہنچا

ہو اگر صبر تو ہو جاتے ہیں پیدا اسباب
پیاس ساحل کی بجھا دینے کو دریا پہنچا

کیوں نہ میرے دل میں جگہ تیر کو دیتا ناصح
کس کی بخشش سے یہ چھوٹا تھا کہاں آ پہنچا

چاند جس طرح سے آئینہ میں ہو عکس فگن
دل میں اس طرح خیالِ رخِ زیبا پہنچا

رات بھر بزم میں ہنگامہ تھا پروانوں کا
شمع جب گل ہوئی پھر ایک نہ شیدا پہنچا

ابھی آنکھوں ہی میں تھا خوابِ جوانی کا خیال
صبح پیری ہوئی پیغامِ قضا آ پہنچا

جب ملاحسن کو اورنگ شہی روزِ نخست
دل کو ہاتھوں پہ لئے نذر کو میں جا پہنچا

دادخواہوں کے اڑے ہوش اسے دیکھتے ہی
ہمہمہ ہو گیا محشر میں کہ وہ آ پہنچا

پہنچیاں تو نے پنہائی تو ہیں او مشاطہ
کہیں دکھ جائے نہ اس شوخ کا پایا پہنچا

عشقِ مجنوں سے ہوا فاش جہاں میں جنید
دور تک تذکرۂ پردۂ لیلیٰ پہنچا

دیکھ کر ان کو ہوا محو میں ایسا یاورؔ
میرے لب تک نہ کوئی حرفِ تمنا پہنچا

مرزا الطاف حسین صاحب لطف

ساقی و محتسب میں اگر ساز باز ہو
پھر آدھی رات کو در میخانہ باز ہو

بندے ہیں ہم کرم کے نہیں جاہ سے غرض
محمود ہو جہاں میں کوئی یا ایاز ہو

رند سیاہ کار کا مسجد میں کام کیا
میخانہ میں جنازہ کی میرے نماز ہو

پھر کچھ نہیں ہے خوف جو ہو ناخدا خدا
طوفان میں لاکھ زیست کا اپنے جہاز ہو

دولت لگے جو ہاتھ قناعت کے دھن میں
منعم کو زر کی پھر نہ کبھی حرص و آز ہو

پست و بلند دھر کا مطلب یہی ہے لطف
ہو سرنگوں کوئی تو کوئی سرفراز ہو

(۱) بدیہہ گوئی کا رسالہ نہایت دلچسپ ہے اور مولوی طباطبائی صاحب کا دیباچہ نہایت مفید مجھے یقین ہے کہ لٹریری مذاق کے لوگوں میں مقبول ہو گا کاش اس قدر مختصر نہ ہوتا۔

(ڈاکٹر محمد اقبال۔ لاہور)

(۲) میری مزید پہچانس کے لئے آپ کے عنایت کردہ "لقمۂ ماہی" (بدیہہ گوئی) کا دلی شکریہ لیکن جس طرح اونچے حلقوں میں کھانے کی میز پر برف (آئس کریم) دو چار چمچوں سے زیادہ لینے کا دستور نہیں یعنی جی چاہے بھی تو شائستگی کا اقتضا یہ ہے کہ "دو ہرانے" کا خیال نہ آئے مجھے اقرار کرنا پڑتا ہے کہ آپ کی کتاب سے میری سیری نہیں ہوئی یعنی لطافت کے ساتھ مقدار موجودہ کافی نہیں۔

اردو لٹریچر میں آپ کی جدت پسند طبیعت کی طرف سے یہ ایک نیا عنوان ہے جس کی تحت میں بذلہ سنجی لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی وغیرہ کے شواہد کثرت سے ملیں گے جن سے یقینی طور پر آپ کے دلچسپ موضوع تحریر کا رقبہ بڑھ جائیگا کتاب کا بوٹا سا قد ہندوستانی مذاق ہے ہم خالص عربوں کی طرح بے میل تو رہے نہیں ہندی ہوتا کوئی وصف نہیں عجمی مذاق کشیدہ قامتی چاہتا ہے اس کے لئے آپ کو ذرا پھیلنا پڑے گا۔ اس کا موقع دوسرے اڈیشن میں باقی رہتا ہے۔

مہدی حسن (افادی الاقتصادی)

(۳) بدیہہ گوئی اردو میں بالکل نیا اور قابل قدر رسالہ ہے اس موضوع پر کوئی کتاب علیحدہ نہ تھی اور کوئی وجہ نہ تھی کہ شاعروں کی اس خداداد قابلیت کو خاص شان کیساتھ مستقل حیثیت سے پیش نہ کیا جائے یہ اضافہ نہایت دلچسپ اور مفید ہے۔ آپ نے جس خوبی اور سلیقہ کے ساتھ ترتیب دی ہے اُس کا اعتراف ہر ذوق سلیم پر واجب ہے۔

حامد حسن قادری (اڈیٹر سعید کانپور)

(۴) ادبیات کی ایک صنف مخصوص جسے فرنچ و انگریزی میں (Belles lettres) کہتے ہیں وہ ہوتی ہے جس کا مقصود تمامتر ادبی چاشنی ہوتی ہے۔ شعراء و اہل ادب کے لطائف و ظرائف

فکاہات و مطایبات و دلچسپ حکایات سب اس عنوان کے تحت میں آتے ہیں

سید ناظر الحسن صاحب ہوش اڈیٹر ذخیرہ نے بدیہہ گوئی کے نام سے اس فن سے متعلق ایک مختصر کتاب شایع کی ہے جس میں بدیہہ گو شعراء کا اردو فارسی عربی کلام مع ان کے مطالب کی توضیح اور ان کے "شانِ نزول" یعنی ان کے موقع و محل کی تصریح کے شایع کیا ہے۔ ابتدا میں مولانا علی حیدر طباطبائی کا ایک محققانہ دیباچہ بھی شامل ہے۔

کتاب کا موضوع بجائے خود نہایت دلچسپ ہے اس لئے کتاب بھی قدرتی طور پر دلچسپ ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ شروع سے آخر تک دلچسپیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ ہے فارسی و عربی کلام کی اردو میں شرح بھی کر دی گئی ہے جس سے محض اردو خواں بھی کتاب کے لطف سے مستفید ہو سکتے ہیں

لیکن عام تذکروں کے مندرج واقعات کو نقل کر دینے سے یہ بہتر ہوگا کہ معاصر شعرا کے جو حالات اب تک دائرۂ تحریر میں نہیں آئے ہیں انہیں قلم بند کیا جائے۔ اس سلسلہ میں آغاز عنوان میر اکبر حسین صاحب سے کرنا چاہئے۔ جن کے کلام کا بیشتر حصہ بدیہہ گوئی کی بہترین مثال ہے یہ کتاب ہمارے سرمایۂ ادب میں ایک پُر لطف اضافہ ہے

عبد الماجد (بی اے)

~~~~~~~~~~

(۵) میں نہایت ممنون ہوں کہ آپ نے اپنی دلچسپ اور سبق آموز کتاب "بدیہہ گوئی" کی ایک جلد بھیجکر مجھے اس کے مطالعہ کا موقع دیا ہے

میں نے کتاب کو اول سے آخر تک نہایت شوق سے پڑھا فی الواقع آپ نے اس مبحث کے لطائف و ظرائف کو نہایت خوش اسلوبی سے یکجا کر دیا ہے اور کتاب بہ ہیئتِ مجموعی اتنی دلچسپ ہے کہ ختم کئے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ افسوس یہ ہے کہ شعرائے اردو کے واقعات نسبتاً کم ہیں جی چاہتا ہے کہ اس سے زیادہ ہوتے بہر کیف جو لوگ فارسی اور عربی کے ذوق شناس ہیں وہ تو دل سے اس مختصر مجموعہ کی قدر کریں گے۔ اردو دانوں کے لئے آپ نے ترجمہ کر دیا ہے بلاشبہ وہ بہت اچھا ہے مگر اصل میں جو لطف ہے وہ ترجمے میں ذرا پھیکا پڑ جاتا ہے۔ بہر حال کتاب بہت دلچسپ اور قابلِ قدر ہے۔

امید کہ ابنائے وطن آپ کی ہمت افزائی کریں گے

مفتی محمد انوار الحق
(ایم اے ڈائرکٹر تعلیمات بھوپال)

~~~~~~~~~~

(۶) عربی میں تاریخ سے کسی قدر فروتر اور عام قصص و حکایات سے بالاتر ایک فن ہے جو ادب و تاریخ کا جامع ہے اس کو محاضرات کہتے ہیں اردو میں اسکی صحیح مثال موجود نہیں ہے گو ادنیٰ درجہ کا اردو میں جو تاریخی سرمایہ بڑھایا جا رہا ہے وہ اسی قسم میں داخل کرنے کے لائق ہے لیکن ان کے مولفین کو چونکہ اُن کو تاریخ کہنے کی تاکید ہے اس لئے ہم اس کو محاضرات کہنے پر اصرار نہیں کر سکتے۔

ابھی حال میں جناب سید ناظر الحسن صاحب ہوش بلگرامی اڈیٹر ذخیرہ حیدرآباد نے بدیہہ گوئی کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے

جواس فن کی صحیح مثال ہے۔ مولف نے عربی فارسی اور اردو کے ماخذوں سے شعراء کی بدیہہ گوئی کے نہایت دلچسپ واقعات جمع کئے ہیں ساتھ ساتھ شعراء کے مختصر تذکرے بھی لکھے ہیں۔ طرز بیان سہل زبان صاف اور واقعات شائستہ ہیں۔

سید سلیمان ندوی
مدیر رسالہ معارف اعظم گڈھ

---

(۷) بدیہہ گوئی پہنچ گئی۔ ماشاء اللہ خوب کتاب لکھی ہے مجھے ایسی جگر کاویاں تہ دل سے پسند ہیں۔ ہزاروں صفحات کی ورق گردانی سے یہ دُرِ شاہوار حاصل ہوئے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی سعی مشکور فرمائے۔

حکیم مظفر حسین اظہر دہلوی

---

(۸) ایک کام سے ذرا باہر چلا گیا تھا اس وجہ سے بدیہہ گوئی کے لئے شکریہ عرض کرنے میں تاخیر ہوئی۔ معاف فرمائیے گا انوکھی چیز ہے۔ کاش اردو شعراء کی بدیہہ گویوں کی مثالیں اور زیادہ ہوتیں۔ کتاب دلچسپ ہے۔ مگر میری ناچیز رائے میں ضرورت سے زیادہ مختصر ہے اردو میں ممکن تھا کہ زبانی روایتوں سے کچھ اچھی مثالیں مل جاتیں۔ بہرحال کتاب قابلِ قدر ہے اور اس کے لئے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

پریم چند

---

(۹) یہ کتاب جناب سید ناظر الحسن صاحب ہوش بلگرامی کے ذوقِ سلیم کا نتیجہ ہے اس میں موصوف نے [illegible]

اشعار کی نہایت عمدہ اور دلچسپ مثالیں پیش کی ہیں عربی، فارسی، و اردو شعراء کی بدیہہ گوئی کے متعلق نہایت دلچسپ واقعات جمع فرمائے ہیں کتاب اس قدر دلچسپ ہے کہ پڑھنا شروع کیجئے تو بغیر ختم کئے ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ قدما کے واقعات کے ساتھ ساتھ اس زمانہ کے مشہور ادیبوں و انشا پردازوں۔ مہاراجہ سر یمین السلطنت بہادر شاد و عالیجناب فخرِ قوم آنریبل نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین صاحب بلگرامی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ کی بدیہہ گوئی کے متعلق واقعات پیش کئے ہیں نواب حیدر یار جنگ بہادر نظم طباطبائی لکھنوی نے ایک معنی خیز مقدمہ بھی اس کتاب کے ساتھ منسلک فرمایا ہے۔ جس میں بدیہہ گوئی کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مقدمہ میں یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ زبان اردو میں بدیہہ گوئی کی مثالیں اس لئے کم پائی جاتی ہیں کہ اردو والوں نے ہندوستان کے فطری و قدرتی اوزان کو ترک کر دیا اور عربی و فارسی شعراء کی تقلید کی موصوف کی رائے ہے کہ جب تک اوزان کو نہ بدلیں اردو میں بدیہہ گوئی نہیں ہو سکتی اگر یہ رائے صحیح تسلیم کی جائے تو اردو کے جن شعراء نے بدیہہ گوئی کے نمونے پیش کئے ہیں اپنی جودت طبع و فکر رسا کا ثبوت دیا ہے وہ واقعی قابل قدر اور لائق ستائش ہیں اور اگر ہم ان کی غیر معمولی ذہانت کا اعتراف نہ کریں تو سخت ناانصافی ہوگی یہ کتاب چھوٹی تقطیع کے دو سو صفحات پر جلی حروف میں نہایت خوشنما طبع ہوئی ہے قیمت صرف ایک روپیہ ہے جو اس گرانی کاغذ کے زمانہ میں زیادہ نہیں ہے ارباب ذوق سلیم کا فرض ہے کہ اس کتاب سے ضرور اپنے کتب خانہ کو زینت دیں۔

مدیر احمد علی [illegible]

ایک نظر اِدھر بھی

کتاب	قیمت
بچوں کی پرورش مصنفہ علیا حضرت فرمانروا بھوپال قیمت فی جلد	۴ر
تربیت الاطفال " " " "	۸ر
بایانت تیمارداری " " " "	۲ر
ہدایۃ الزوجین " " " "	۸ر
سوال و جواب تندرستی " " "	۶ر
ہندوستانی گھروں میں تیمارداری " " "	۶ر
معیشت " " "	[illegible]
معاشرت "	[illegible]
سبیل الجنان " " "	۱ر
تہذیب النسوان " " "	۶ر
تیماری مرتبہ حجی بخش صاحبہ مہتمم مدرسہ سلطانیہ -	[illegible]
رموز فطرت مرتبہ مولوی محمد مہدی صاحب -	۸ر
انسان -	۱
ازواج الانبیا - منشی محمد حسین صاحب محوی لکھنوی -	[illegible]
دوپشک اکانمی - ہر چہار جلد مفتی محمد انوار الحق صاحب ایم اے	[illegible]
باغبانی - سید محمد مصطفےٰ صاحب بی اے -	[illegible]
تربیت الاخلاق مصنفہ عبدالکریم صاحب (علیگ)	۲ر
پہیلیاں مصنفہ سید مخدوم عالم صاحب مارہروی -	۱ر
آغوش مادر " " "	۱ر

نوٹ ان سب کتابوں کی قیمت مجلد ہے اور محصول ڈاک ذمہ خریدار ہوگا -

تازہ تصانیف ہز اکسلنسی راجہ راجایان سر کشن پرشاد مہاراجہ بہادر یمین السلطنت جی سی آئی ای شاد بالقابہم

رباعیات و قطعات شاد جو آرٹ پیپر پر نامی پریس کانپور میں چھپوائی گئی ہے قیمت صرف (عہ) دین حسین - مجلد قیمت علاوہ محصول (۴ر) ماتم حسین شیعہ قیمت علاوہ محصول ۴ر ایمان شاد فارسی ۴ر (سیر سنسار انگریزی تحت سفرنامہ قیمت ہے)

المفرد المرکب

مولوی عبداللطیف خاں صاحب (منشی فاضل)

زبان فارسی کے وہ الفاظ جو بظاہر مفرد یا جامد معلوم ہوتے ہیں مگر درحقیقت مرکب ہوتے ہیں اور باعتبار معنی اپنی اصل شے کے ساتھ عمدہ تعلق ہے صرف قیمت قسم اول ۱۲ر قسم دوم ۸ر علاوہ محصول ڈاک

زود پشیمان

جو ایک بالغ نظر فلسفی اور خوش فکر شاعر نے حال ہی میں لکھا ہے اس کی ابتدا میں مولانا شرر - مرزا رسوا مولانا سید سلیمان ندوی اور مسٹر سجاد حیدر (یلدرم) کی تقریظیں ہیں جس سے کتاب کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے قیمت صرف ۱۰ر سکہ کلدار علاوہ محصول

تحفۂ سائنس

یعنی مجموعہ عام فہم علمی مضامین حصہ اول مصنفہ شیخ فیروز دین مراد بی اے، ایم ایس سی پروفیسر علوم طبیعیات ایم اے او کالج علیگڑھ یہ مضامین ہیں ضخامت تقریباً چار سو صفحات مع ایک مبسوط فرہنگ مصطلحات قیمت عہ مصنف علیگڑھ کے پتہ سے طلب کیجیے -

---

خط و کتابت بنام منیجر ذخیرہ اندرون دروازہ ... آنی چاہیے